جھونکے "شمیمِ سخن" کے

(مجموعۂ کلام)

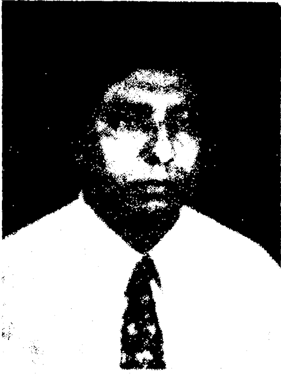


صاحبزادہ میر بُرہان علی خاں کلیمؔ



رنگ اڑا دے نہ تغزل کا زمانے کی ہوا
تم حِنا بن کے میرے دستِ ہنر میں رہنا

(کلیم)



انتساب

میرے نورِ چشم، میرے فرزند دلبند صاحبزادہ میر احمد علی خاں کے

کبھی فراموش نہ ہونے والے

بھرپور جذبات، دلی خواہشات و پدری محبت

کے نام

جسکی بے لوث دلچسپی اور بے انتہا اعانت و تعاون

سے میرا یہ مجموعۂ کلام منظر عام پر آسکا

اور

جس کے لئے بارگاہِ رب العزت میں سراپا عجز و نیاز دست بدعا ہوں۔

خدایا ـــــ! اُس کی آرزوئں، دلی خواہشوں اور مُرادوں کے پھولتے پھلتے

چمن کو ہمیشہ اپنی رحمتوں کی آبیاری سے سرسبز و شاداب و آباد رکھ

آمین!!

(کلیم)

تبصرہ
اربابِ فکر و فن

ترتیب :

صفحہ نمبر

کلیمؔ کی شاعری

ایک جائزہ

صاحبزادہ میر برہان علی خاں کلیمؔ حیدرآباد کی مخصوص علمی و ادبی محفلوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں، جہاں وہ اپنی شمعیں جلاتے رہتے ہیں۔ اپنی افتادِ طبیعت اور بے نیازانہ روش کے سبب عام شعر و ادب کے جلسوں سے انھوں نے خود کو دُور رکھا ہے۔ کم آمیز ہیں، اس لیے طویل شعری ذخیرہ کے باوجود ان کا یہ پہلا شعری مجموعہ بہت تاخیر سے اب منظرِ عام پر آرہا ہے۔

جناب کلیمؔ کی شعری صلاحیتیں بڑی خوشگوار علمی و ادبی محفلوں میں پروان چڑھیں اور اس زرخیز فضا اور صحبتوں سے انہوں نے بھرپور کسبِ ہنر کیا۔ اربابِ کمال کے آگے زانوئے ادب بھی تہہ کیا۔ مشورۂ سخن سے نہ صرف ان میں اعتماد پیدا ہوا بلکہ اظہارِ خیال اور شعر کے فن پر اپنی گرفت مضبوط کی۔

زیرِ نظر شعری مجموعہ ان کی نصف صدی کے شعری سرمایہ کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں غزلیں بھی ہیں اور دیگر اصنافِ سخن بھی۔ لیکن جس صنف پر پوری توجہ دی ہے وہ غزل ہے۔ غزل کو اردو کی آبرو بنانے والے ہر دور میں تھے آج بھی ہیں کلیمؔ اس زنجیر کی ایک کڑی ہیں۔

برہان علی خاں کلیمؔ کی شاعری کلاسکیت سے اپنا رشتہ جوڑتی ہے اور غزل

کی مستحکم روایات سے روشنی لیتی ہے۔ غزل کی روایت میں اسے جو جواہرات حاصل ہے وہ ایک بنیادی وصف ہے۔ کلیم کے تغزل میں بھی اس بنیادی وصف یعنی جمالیاتی قدر نے ایک متوازن جذبہ کی صورت اختیار کی ہے لیکن روایت کی اس پاسداری کے ساتھ ان کی غزل اپنے دَور کے تقاضوں سے بھی آشنا ہے۔ مقصدیت سے انحراف تو نہیں کیا ہے لیکن یہ مقصدیت تمام و کمال وہ نہیں جو جدیدیت کا طرۂ امتیاز ہے۔ چنانچہ بڑی اعتدال پسندی کے ساتھ انہوں نے اپنی غزل کی کائنات کو اپنے درون تک محدود نہیں رکھا ہے۔ اطراف و اکناف سے آنکھیں بند نہیں کی ہیں بلکہ ایک حساس دردمند انسان کی طرح زندگی کی تلخیوں، ناامیدیوں اور ٹوٹتی قدروں کو جس صورت میں دیکھا، محسوس کیا اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ غزل کے دامن کو اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا ہے۔ ذات سے باہر جھانکنے کی بھی کوشش کی ہے اور اپنی ذات کے دریچوں سے ہی ماحول کا مطالعہ کیا ہے۔

جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے، اسلوب تقلیدی بھی ہو سکتا ہے اور تخلیقی بھی۔ کلیم نے نئی غزل کے دریچوں سے جو تازہ ہوا لی ہے اس نے روایتی اسلوب کی فرسودگی کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ قدیم کو جدید سے علٰحدہ کرنے کے بجائے انہوں نے جدید کو قدیم کے ساتھ منسلک کیا ہے۔ لہجے کو بدلنے اور کہیں کہیں نئی لفظیات کو شامل کرنے کی کوشش نمایاں ہے جو ان کی غزل کو نئے فکری عوامل سے مربوط کرتا ہے۔ ذیل کے اشعار ان تجربوں اور مرحلوں کے رویہ کا اظہار ہیں، جن سے وہ ہو کر گزرے ہیں۔

تجربوں کی چلچلاتی دھوپ، غم کی وادیاں
کتنے برفیلے شعور و فکر پگھلاتی رہیں

وفا کی راہ میں ہر وقت کی صلیبوں تک
ترے قریب سے گزرے تو دُور تک پہنچے

تراشا شہر کے شیشہ گروں نے کچھ ایسا
خود اپنا چہرہ بھی اب ہے کہاں نہیں ملتا

پھر بھی نہ بجھی شمع خیالوں کی تمہاری
آندھی بھی بہت تیز تھی بارش بھی بہت تھی

تری نظر سے گرے ہم تو یوں گرے جیسے
خزاں کے برگ تھے زد میں ہوا کے رکھے تھے

وقت کے اندھیروں کو اب پناہ دیتے ہیں
شہر بے چراغاں میں روشنی کے کاشانے

جو پھیل جاتی ہے آکر ہمارے آنگن میں
وہ بوئے خوں کہ نہ جانے کدھر سے آتی ہے

صاحبزادہ کلیمؔ کی غزلوں کی ایک قابلِ ذکر خصوصیت، ان کی مشکل پسندی
ہے جو اپنی فکر کے لیے شعوری طور پر طویل ردیفوں کی تلاش میں رہتی ہے۔
دشوار قوافی سے انہیں مربوط کرتی ہے۔ کسی زمانے میں مشکل یا طویل ردیف میں غز

کہنا اساتذہ کا شوق رہا ہے۔ آج کے دور میں اس کی بازگشت کلیم کے یہاں ملتی ہے۔
وہ اپنی فکر کا آہنگ ان میں ابھارتے ہیں اور غور و فکر سے کام لے کر یہ کوشش کرتے
ہیں کہ بات میں بات پیدا کی جائے۔ قوافی و ردیف کا میل ملاپ کچھ ایسا ہے۔
تصویر ہو بہو، گھر میں دیکھوں، چمن سے نکلی ہے، شجر سے آتی ہے، مقام، کس کے لیے تھا،
منزل تک آیا ہے کوئی، سازش بھی بہت تھی، دوستی کا دروازہ، ہمدم کبھی پہلے نہ تھا،
ناکام ہونا تھا ہوئے، تصویر لیئے پھرتی ہے، خواب سے پہلے آتا ہے، تصویر بول اٹھی،
گفتار چھین گئی، دل کے آس پاس، الزام بھی غلط، بانکپن بھی جھوٹ، کرنیں، روشن روشن،
کنارہ، مجھے فریب نہ دو، وغیرہ

ان سے جو مطلع بنائے گئے ہیں مثال کے طور پر یوں ہیں:

ہوا کہاں کی یہ ہو کر چمن سے نکلی ہے
کہ بوئے خون ہر اک پیرہن سے نکلی ہے

میرے ماضی، حال، مستقبل تک آیا ہے کوئی
بن کے سایہ ساتھ ہر منزل تک آیا ہے کوئی

دل شعلہ گیر، برقِ تپاں کس کے لیے تھا
اِس گھر سے جو اٹھا وہ دھواں کس کیلئے تھا

مرا خونِ وفا شمعِ سرِ محفل میں رکھ دینا
تم اپنے دل کے سارے زخم میرے دل میں رکھ دینا

میں حق شناس ہوں یارو مجھے فریب نہ دو
فریبِ زیست کے مارو مجھے فریب نہ دو

شبنم کی نمی، دھوپ کی تابش بھی بہت تھی
باتوں میں گلے بھی تھے ستائش بھی بہت تھی

اشک شعلے میں ڈھلے، یہ مجھے منظور نہیں
حسن پر داغ لگے یہ مجھے منظور نہیں

اِن زمینوں میں نئے پن کا احساس ہوتا ہے اور اس طرح کلیمؔ کی غزل اپنا ایک چہرہ الگ بھی بناتی ہے۔

بہ حیثیتِ مجموعی صاحبزادہ کلیمؔ نے طویل مشقِ سخن کی ہے اور اپنی شاعری کا سفر بڑے اعتماد سے کیا ہے۔ غزل کو بہرحال غزل کے مزاج کے ساتھ برتا ہے جس میں سلیقہ بھی ہے، شائستگی بھی ہے اور شگفتگی بھی۔ جذباتی بہاؤ میں گم ہو جانے کے بجائے صداقتِ خیال کی تلاش کو اہمیت دی ہے۔ آج جبکہ بے رہروی، بے سمتی اور بے رنگی کا رویہ غزل میں فروغ پا رہا ہے، اس تناظر میں یہ شعری مجموعہ دھوپ میں ٹھنڈا سایہ دیتا ہے۔ ذکرِ سخن سے شاعر کی گہری وابستگی کا جو خلوص کارفرما ہے، وہ قابلِ پذیرائی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اربابِ سخن میں اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

ڈاکٹر علی احمد جلیلی

جلیل منزل۔ سلطان پورہ
حیدرآباد

کلیمؔ اور اُن کی شمیمِ سخن کے جھونکے

آج کی غزل صرف محبوبۂ دل نواز سے بات کرنے اور اس کی عشوہ طرازی سے شکوہ سنج ہونے کا وسیلہ نہیں رہی، شاید اس لیے بھی کہ آج نہ وہ محبوبہ اپنی حشر ساماتیوں کے ساتھ رہ گئی ہے اور نہ اس کی وفا اور جفا کا وہ زندگی آمیز یا جاں لیوا تصور۔ لیکن محبت وہ جذبہ ہے جس میں عورت کی شمولیت کے بغیر درد آشنائی کا تصور، جاں کنی کی اس منزل تک نہیں لے جاتا جہاں غم و آلام تقسیم ہو کر حالات کی صعوبتوں اور بے ذہنی کے دکھ کو شعور کی گہرائی تک پہنچا سکیں۔

صاحبزادہ کلیمؔ کی غزلیں ایک ایسا تاثر فراہم کرتی ہیں کہ آن سے خانوادۂ آصفی کا طنطنہ چھن جاتا ہے تو زندگی اپنے دوسرے اہم مسائل ان کی غزل کے حوالے کر دیتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان کو اپنے اسلاف پر فخر نہیں ہے لیکن ایسا بھی ہے کہ وقت کی کھنچتی طنابیں ان کی شعری اہلیت نے تھام رکھی ہیں۔ یہ عمل غیر شعوری طور پر کچھ کھو کر کچھ پا لینے سے عبارت ہے اور اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ان کے شعور نے حصولِ ذات کے لیے ایسا سامان مہیا کر لیا جو اجداد سے وراثت میں نہیں ملا تھا۔

اُٹھا کے سر نہ چلو یوں غرور سے ورنہ
نگاہِ وقت یہاں تیغِ بے نیام بھی ہے

تماشیانہ، نہ جنازے پہ غلافِ کمخواب
سادگی! تو ہی غریبوں کے سفر میں رہنا

خدایا کیا غضب تھا، مرتبہ دے کر خلافت کا
قیامت کا یہ فتنہ خاکداں دِل میں رکھ دینا

وہ کڑی دھوپ کے ساتھی جو شجر بن کے رہے
ہائے اب اُن کے گھنے سائے بھی سر سے اُٹھے

گزری تمام عمر کلیم اپنی اِس طرح
سو بار زندگی ملی، سو بار چھن گئی

لاکھ بے سروساماں زندگی رہے گھر کی
پردہ دار ہے پھر بھی بے کسی کا دروازہ

وابستہ تیری ذات سے اک اور ذات ہے
پڑھتا ہے کیا کتاب گزشتہ حیات کی

ایسے بہت سے شعر ان کے مجموعۂ کلام میں دامنِ دل تھام لیتے ہیں اور پڑھنے والے کو اس احساسِ زیاں سے گزارتے ہیں کہ ایسے اشعار کا اثاثہ ساتھ رکھ کر کلیمؔ نے خود کو اس قدر چھپا کر جی لینا کس طرح گوارہ کر لیا۔ دیکھیئے ان کے پاس جو زادِ سفر ہے وہ ہرگز ایسا تو نہیں ہے کہ اس پر پردہ اُڑھا کر اس کی زبوں حالی چھپائی جائے جب کہ اس سامانِ سفر میں وہ حسنِ خوابیدہ ہے جو دیکھنے والے کو آنکھیں مَل کر بیدار کر سکے۔

کیا آبروئے فکرِ سخن بھی گئی کلیمؔ
اب کیا بتائیں کون غزل خواں ہے اِن دنوں

ہر رہ گزارِ حسن پہ میلہ ہوس کا ہے
اب کوئی قیس ہی نہیں محمل کے آس پاس

دیدہ و دل ایک دوشیزہ کے سپنوں کی طرح
انتظارِ موسمِ گُل سے بہلتے بھی رہے

وفا کی راہ میں ہم وقت کی صلیبوں تک
ترے قریب سے گزرے تو دور تک پہنچے

اِن پھانسیوں پہ نام ہے اپنا لکھا ہوا
ہم معتبر ہیں تجھ سے وفا کے بغیر بھی

کچھ تو اے صبا بتلا میرے بعد گلشن میں
جشنِ گل بپا اب کے کس طرح ہوا ہوگا

کلیمؔ غزل کے مزاج داں تو ہیں ہی اور ان کی غزل کے اشعار اس وصف کی گواہی دیتے ہیں، ساتھ ہی انہوں نے پابند نظمیں بھی کہی ہیں جو بھ درہیں اس کے باوجود ان کے طبعی انکسار میں ان کا اعتماد سوالیہ علامت بن کر گھل مل جانے سے انکاری ہے۔ وہ ایسے شعر کہتے ہوئے بھی اپنی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔

شب نے بھیگی زلفوں سے سب جھٹک دیئے تارے
دیکھ ان گھٹاؤں سے دن نکل رہا ہوگا!

مرہونِ چشمِ نم نہیں اشکِ غمِ نہاں
برسات ہوگئی ہے گھٹا کے بغیر بھی

زمیں کی تنگیِ داماں سے تنگ دل ہوکر
چلے ہیں سوئے فلک ارتقا کے دیوانے

کچھ راس بھی آئے تھے بدلتے ہوئے موسم
کچھ پھول کی فطرت میں نمائش بھی بہت تھی

آئینہ دیکھتے ہوئے جب بھی خیال میں
میں چپ رہا تو آپ کی تصویر بول اٹھی

غزل مطعون ہے، ملعون ہے لیکن کیا کیجیے کہ غزل شاعری کی جان ہے۔ شرط بس یہی ہے کہ غزل کو صرف قافیہ پیمائی کے لیے برتا نہ جائے بلکہ اس کی مزاج داری کچھ اس طرح ملحوظ رکھی جائے کہ اس کی درد آشنائی، دروں بینی، شعور سے گہری موانست، مضامینِ نو کے لیے آپ کا لہو مانگے۔ لیکن یہ سب کچھ کتنوں کو نصیب ہے یا نصیب ہو سکتا ہے اور جو یہ نہیں ہے تو غزل آپ کی ہو کر بھی اپنی ساری توانائی و رعنائی کے ساتھ آپ کی نہیں ہو سکتی۔ غزل کا ایک وصف تو یہ ہوا، دوسرا وصف یہ بھی تو ہے کہ وہ اتنی مقبول صنفِ سخن ہے کہ ہر کس و ناکس، ہر شاعر و متشاعر، اس کی زلفِ گرہ گیر کا والہ و شیدا ہے۔ دو مصرعوں میں کائنات کو سمو لینے کا ظرف غزل ہی کے حصے میں آیا ہے۔ اتنی ساری حصار در حصار گیرائی کے باوجود غزل ہی وہ صنفِ سخن ہے کہ ہر ذہنِ رسا ہی نہیں ذہنِ فرومی سے بھی نباہ کر کے اپنا اسیر بنا لیتی ہے اور عوام الناس کی آسودگی کو بھی دلاسا دے جاتی ہے۔ یہیں جا کر غزل کو مشاعرے کی گلے بازی اور کتاب کی یکّی روشنائی سے الگ کیا جا سکتا ہے۔

کلیمؔ کی رمز آشنائی، غزل کے اس نازک فرق کی پرکھ رکھتی ہے۔ ان کو اس کا احساس ہے کہ ایسے شعرا جو عمر بھر اپنی ترنم ریزی سے مشاعرے لوٹتے رہے اور شعر کی فرسودگی کو آواز کے جادو میں چھپاتے رہے۔ لیکن آج آواز کھو گئی ہے تو اپنی شناخت بھی کھو بیٹھے ہیں۔ وہ کسی سے گلہ گزار نہیں ہیں، خود سے سوالی ہیں کہ —

کیا آبروئے فکرِ سخن بھی گئی کلیمؔ
اب کیا بتائیں کون غزل خواں ہے ان دنوں

تو ہم ان کے کلام کی تازگی و طرفگی کی جانب متوجہ ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ آج کل جو سپاٹ اور بے روح شاعری مشاعروں کا حاصل ہو کر رہ گئی ہے اور جو ذہنی تربیت کو تمسخر کی طرف لے جا رہی ہے اس کے پیچھے ایسی ہی فتوحات کی کرشمہ سازیاں ہیں جن سے شعر کو بچا کر ہنروری تک لے جانا صحت مند شعری روایات کا امین ہوتا ہے۔

اب تو یہ حال ہے کہ سنجیدہ شاعری کا وقار یہاں تک جراحتوں کا شکار ہو گیا ہے کہ وہ نظم بھی سنجیدہ غزل کے مدمقابل نہیں رہی جو چلی تھی وسعتِ بیان کا سہارا لے کر الفاظ میں دنیا سمیٹنے کے لیے اور اب اس میں الفاظ سمیٹنے کا یارا بھی نہیں رہا۔ سپاٹ شاعری غزل سے زیادہ نظم کی روایت و شناخت ہو کر رہ گئی ہے۔

غزل کی اس مقبولیت کو اس صنفِ شعر کی واماندگی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ غزل بذاتہٖ غریب نہیں ہے۔ اس کی امیرانہ بلکہ بعض وقت آمرانہ وسعتیں کشادہ ذہنی سے کبھی معانقہ اور کبھی مجاہدہ کرتی رہی ہیں اور اسی رنگا رنگ خیرگی میں غزل کی مقبولیت عیاں بھی ہے پنہاں بھی۔ کلیمؔ کی غزل میں تازہ کاری و شادابیِ خیال کی کار فرمائیاں بکھری پڑی ہیں۔ اب ان اشعار کی درایت کو آپ کس زمرے میں رکھیں گے۔

دل میں نظر میں جاں میں نہ تھے تم نہاں مگر
ہاتھوں کی ہر لکیر میں میری چھپے تو تھے

اکثر یہی ہوا ہے کہ جب عرضِ شوق میں
عجلت نہ ہو سکی ہے تو تاخیر بول اٹھی

پھر بھی نہ بجھی شمع خیالوں کی تمہارے
آندھی بھی بہت تیز تھی بارش بھی بہت تھی

غزالو! کچھ کہو رودادِ صحرا، کس لیے پھرسے
صدائے قیس کوئی سوئے ویرانہ نہیں اٹھی

ان اشعار میں رمز و کنایہ اپنی ایمائیت کو کس بانکپن سے معانی در معانی بنائے ہوئے ہیں۔

آج اردو کے رسالے اٹھا لیجئے، سب سے کمزور حصہ نظموں کا ملے گا۔ جو دامنِ دل تو چھوڑ دیتے ہیں، دامنِ دریدہ بھی نہیں پکڑتا۔ اسی حالتِ زار کو آپ قاری کی بے نظری اور اس کی علمیت کے فقدان کا نام دے کر خود کو مطمئن کرلیں تو بات نہیں بن جاتی۔

"کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لیے" کو تسبیح کے دانوں پر وردِ زباں کر لینے سے نظم کی فوقیت ثابت نہیں ہوتی۔ اس وسعت کا ادراک کیے بغیر عجزِ بیاں کی غیر تخلیقی بے مائیگی کو نظم کبھی قبول نہیں کرتی۔ ایسے میں خم ٹھونک کر کسی صنفِ سخن کو دوسری صنفِ سخن سے مجادلے و مخاصمے کے لیے میدانِ ادب میں اتار کر لمبی تان لینے سے سخنوری کا یہی حال ہوتا ہے جو اب ہو رہا ہے۔ دونوں اصنافِ سخن، سہل پسندی کا یہاں تک شکار ہو گئے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ خراب نظم خراب غزل کے لیے راہ بنا رہی ہے کہ اس یگانگت میں فن شہید ہوتا رہے۔ شعر و ادب کی اس بے آبروئی میں دفتر کے دفتر کھولنے اور بند کرنے کے بعد کہیں اچھی

شاعری مل جاتی ہے تو ٹھٹک کر ٹھہر جانا ہی پڑتا ہے۔
مجھے خوشی ہے کہ کلیمؔ کی شاعری آپ کو اچٹتی نظر ڈال کر گزر جانے کی اجازت ہی نہیں دیتی۔ اس میں وہ کس بل ہے، وہ دم خم ہے، وہ رعنائی و شادابی ہے، وہ مہک اور لہک ہے کہ اشعار ذہنِ رسا پر کمند پھینکتے رہتے ہیں، جن سے بچ کر نکل جانا مشکل ہے اور اسی مشکل پسندی میں آپ حظ محسوس کرتے ہیں اور لطافت آشنا ہو جاتے ہیں۔ شعر کی جمالیات کے لیے یہ وصف بڑا وصف ہے۔

اُڑتے تھے شہرِ امن و اماں کی فضا میں باز
پنجوں میں لیکن اُن کے کبوتر دبے تو تھے

ہم چلے تھے دنیا کے درد بانٹنے لیکن
گردشِ جہاں جانے کیوں تھکی تھکی سی ہے

رات چوس لیتی ہے اور خون تاروں کا
دن کے جب نکلنے میں دیر ہونے لگتی ہے

اب تو ہر سوچ کی تتلی کے پروں پر جیسے
راکھ ہر خواب کی تعبیر لیے پھرتی ہے
میں کلیمؔ اپنے تعارف سے گریزاں ہوں مگر
میری ندرت مری تحریر لیے پھرتی ہے

میں اس شعری مجموعے کی پذیرائی کے لیے بہت خوش آئند توقعات وابستہ کیے ہوئے ہوں جو انشا اللہ پوری ہوں گی اور زمانہ کلیم کے مستقبل کا تمنائی رہے گا۔

اقبال متین ۲۴ فروری ۲۰۰۰ء
کہانی۔کتاب نگر۔ نظام آباد
اے پی (۵۰۳۰۰۱)

شریفانہ رنگِ تغزّل کا شاعر

صاحبزادہ میر بُرہان علی خاں کلیمؔ

آج کی اردو غزل کے کئی رنگ ہیں ۔ وہ موضوعات جو اگلے وقتوں میں غزل کے لئے ناموزوں سمجھے جاتے تھے ۔ آج کی غزل نے اُن موضوعات کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے ۔ آج کی غزل نے دلی جذبات' لطیف احساسات' واردات اور کیفیات کے اظہار سے اگر پوری طرح قطع تعلق بھی نہیں کیا ہے تو مضبوطی سے جڑی ہوئی بھی نہیں ہے ۔ آج کی غزل کا لہجہ لطیف اور سادہ بھی ہے اور سنگلاخ و کھردرا بھی ۔ اس صنفِ سخن کو شاعروں نے سلیقہ سے برتا ہے اور کبھی کبھی سیاسی اور سماجی نعرہ بازی سے اس کے چہرے کو مسخ بھی کیا ہے ۔ جدید طرز نے جہاں غزل کو ایک علامتی کنایاتی اور استعاراتی رنگ و آہنگ سے روشناس کیا ہے ۔ وہیں نام نہاد جدت پسندی اور اور بے جا و بے سود و برہنہ بے باک نگاری نے اس کے مزاج کو بگاڑا بھی ہے ۔ غزل کے لئے چاہے وہ روایتی انداز ہو یا اسلوبِ جدید' زبان و بیان کا رچاؤ بے حد ضروری ہے ۔ خیالات کی پاکیزگی اور اظہار کی شائستگی سے بعض شعراء نے غزل کو ایک شریفانہ رنگ بھی دیا ہے ۔ ایسے ہی ایک شاعر صاحبزادہ بُرہان علی خاں کلیمؔ ہیں ۔

حضرت کلیم کی غزل گوئی اگرچہ دوسرے غزل گو شعراء سے بالکل ہی الگ تھلگ نہیں ہے ۔ لیکن ان کے نرم اور صاف ستھرے لہجے نے اپنے لئے غزل کا ایک پُرسکون گوشہ تلاش کر لیا ہے ۔ اپنی غزل کے لئے حضرت کلیم زمین اور بحر کے انتخاب میں اگرچہ روایت کی طرف زیادہ جھکاؤ رکھتے ہیں ۔ اور معلوم اور مانوس قوافی و ردیفوں پر ہی اکتفا کرتے ہیں لیکن مضامین اور موضوعات میں تنوّع کا زیادہ رجحان بھی رکھتے ہیں ۔ انہیں پُرانے اور دہرائے ہوئے مضامین کو بھی ایک نئے' منفرد اور الگ انداز سے پیش کرنے کا فن بھی خوب آتا ہے ۔ جیسے وہ کہتے ہیں ۔

شعور مجھ کو میسّر ہے نور و ظلمت کا — حیاتِ نو کے نظارو مجھے فریب نہ دو
ہے تیرگی کے سوا کیا تمہارے پہلو میں — حسین چاند ستارو' مجھے فریب نہ دو

شہروں اور شہری زندگی کی مصروف ساعتوں کا ذکر، اُن کی گہما گہمی اُن کی عمارتوں میں چھُپے ہوئے اسرار، بے چینی اور کرب کی باتیں شعر کے لبادوں میں یوں تو بہت ہوئی ہیں۔ لیکن ان حقیقتوں کا اظہار اتنے سیدھے سادے انداز میں کم ہی ہوا ہے۔

دکھائے لاکھ تماشائے رنگ و بو لیکن
وہ شہر، شہر ہی کیا جس میں جی ذرا نہ لگے

اور اُن لوگوں کی خشونت، درندگی اور فسادِ ذہنی کا نفسیاتی علاج ایک دعا ہے (جو دراصل ایک بددعا، کا خوبصورت اظہار ہے) خوب کیا ہے۔ کہتے ہیں۔

جلا جلا کے کسی گھر کو خوش جو ہوتا ہے
خدا کرے وہ اُسے اپنا آشیانہ لگے

کوئی ایسا عمل جو سماجی اور اخلاقی اعتبار سے غیر انسانی بلکہ شیطانی لگتا ہو۔ اُس کے خلاف بھی نرم اور شریفانہ لہجہ میں اس انداز سے اظہار کرنا کہ خود اسکے عمل کے مرتکب کے دل پر ندامت اور پشیمانی کا گہرا نقش مرتسم کر دے وہ شعر کے کامیاب اور موثر ہونے کا ثبوت ہے۔

حضرت کلیم نے غزل گوئی، تفنّنِ طبع اور تعیشِ ذہنی کے لئے نہیں کی۔ بلکہ اُنہوں نے اپنے طرف و نواح میں پھیلے ہوئے زندگی کے نت نئے رنگوں، مختلف گوشوں اور اُس کے رویوں کا بڑی توجہ اور انہماک سے مشاہدہ کیا اور پھر اُنہیں اس سے جو تجربات حاصل ہوئے ان تمام کو اپنی تخلیق کا موضوع بنایا۔ اگرچہ حضرت کلیم کو بچپن سے جو ماحول ملا وہ آسائشوں، سہولتوں فرصتوں اور بے فکری کا ماحول تھا۔ اقتدار و دست بستہ ان کے آبا و اجداد کی پیشی میں رہا۔ جس کے سبب ان کی شاعری کا رنگ تو رومانی، اور حسن پرستانہ ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن فطرکا بُردباری حلم، انکساری اور تن آسانیوں سے بے نیازی نے زندگی کے درد اور کرب کو محسوس کرنے، وارداتِ قلبی کو سمجھنے اور درونِ ذات کی کیفیات کو اپنے قلم کی زبان سے اظہار کرنے کی راہ دکھائی۔ شاہانِ آصفیہ کے صاحبزادوں میں شامل ہونے کے ناطے اُنہیں آسائشیں بھی نصیب تھیں۔ اور رقص و موسیقی و چنگ و رباب اور سرور و طرب کی محفلوں کا ماحول بھی ملا۔ لیکن صاف ستھرے ادبی ذوق نے ان محفلوں میں سے صرف وہ باتیں چن لیں جو عناصر کو قابو میں رکھنے

کے لئے ضروری ھیں ۔ اور انہوں نے اپنی ذات کے اندر چھپے ہوئے اپنے نکتہ چیں کو ان مخملوں کی خواب آگیں لوریوں سے دور رکھا اور اُسے کبھی سونے نہ دیا ۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے آسانیوں کی راہوں کے سراب کو پہچان لیا ۔

آسانیوں کی راہ جو پائی تو یوں لگا
ہر شئے حسیں ہے منزلِ مشکل کے آس پاس

حضرتِ کلیم نے ہر زمانے کی چاپ کو اپنے دل کی دھڑکنوں کے قریب محسوس کیا ہے ۔ انہوں نے عہدِ رفتہ کی قدروں کو بھی سینہ سے لگایا ہے اور عہدِ نو کی تیز روی اور اجالوں کو بھی اپنی آنکھوں کی گہرائیوں میں اُتارا بھی ہے اور پھر اپنی سانسوں کے ارتعاش پر ڈولتے ہوئے احساسات کو اُمید و بیم اور یقین و گمان کے درمیان سے گذارا بھی ہے ۔

اُن کا خامہ حیران ہے کہ عہدِ نو کی چکا چوند کے باوجود اُن کا دِل اِس روشنی کو زینتِ قرطاس بنانے سے کیوں گریزاں ہے ۔ وہ کون وسوسہ ہے جو رخشِ قلم کا عناں گیر ہے ۔ اور دل میں بدگمانیاں بو رہا ہے ۔

کتنا روشن ہے عہدِ نو، پھر بھی
دِل ہے کیوں بدگماں، خدا جانے

یا پھر

خوف سے ہے زمینِ دل لرزاں
کب گرے آسماں، خدا جانے!

حضرت کلیم کا سب سے بڑا وصف اُن کی نرم گوئی اور دھیما لہجہ ہے وہ اپنے مشاہدہ تجربہ اور احساس کو چاہے وہ کتنا ہی سخت اور جاں گداز کیوں نہ ہو بہت ہی دبی ہوئی آواز اور شائستہ لہجہ میں بیان کرتے ہیں ۔ آج کی نام نہاد بے باکی، بے موقعہ اور بے وجہ برہنہ گوئی اور پُر شور اور کرخت اندازِ بیان سے اُنہیں پرہیز ہے ۔ اظہار کی نفاست اور گفتار کے آداب سے وہ خوب واقف ہیں ۔ اُن کے قلم نے حسنِ شعور اور سلیقہ مندی کی آغوش میں پرورش پائی ہے ۔ اُن کے ہوش و حواس، اُن کی بینائی اور اُن کی سماعتوں کو جو کچھ کے

جو زخم جو جراحتیں اور جو تلخیاں، سماج اور معاشرہ کی ناہمواریوں اور زمانے کی چیرہ دستیوں سے ملے ہیں، اُنہیں بھی جناب والا نے بڑی خندہ پیشانی اور زیر لب تبسم کے ساتھ سخن کا پیراہن عطا کیا ہے۔ آپ کی شریفانہ طرزِ نگارش ہی نے آپ کو سب سے الگ تھلگ ایک کنجِ عافیت اور ایک گوشۂ پرسکون عطا کیا ہے جسکی وجہ سے آپ پُرشور شعری محفلوں، اور ہنگامہ برپا کرنے والے مشاعروں سے دور اپنی تنہائی اور شکیبائی کو ردائے تغزل میں ڈھانپ رکھتے ہیں۔

جو شعر آپ کے مزاج اور شخصیت کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں وہ تقریباً ہر غزل میں اسلوب، لہجہ اور تیور کی نیرنگی کے ساتھ موجود ہیں، اُنہوں نے اپنی ذات کو کائنات کی وسعتوں میں اور کائنات کی پہنائیوں کو اپنی ذات میں اُتارا ہے۔ اور ذات و کائنات کے غم کو معتبر جانا ہے اور نیا اعتبار بھی دیا ہے۔ وہ اپنے اشعار کی گہرائیوں سے اس طرح ابھرتے ہیں کہ اپنے مزاج کے ہر نقش کو پوری دیانت داری سے اُجاگر کر دیتے ہیں۔

فضائے عالمِ کیف و سرور تک پہنچے
غموں کی دھوپ میں تپ کر شعور تک پہنچے

—

بدلی تیری نگاہ تو ہم تشنگانِ شوق
اُٹھے غمِ حیات کے ساغر لئے ہوئے

—

یوں شامِ غم ہے حالِ دلِ بدنصیب کا
مجرم ہو جیسے کوئی سزا کاٹتا ہوا

—

شب نے بھیگی زلفوں کے سب جھٹک دیئے تارے
دیکھ اِن گھٹاؤں سے دِن نکل رہا ہوگا۔

—

خوشبوئے فکر و فن پہ شبِ غم نہ چھا سکی
ہر جھونکا مشکبار، شمیمِ سخن کا ہے

—

کیا بات ہے کہ شانِ جنوں ہم میں، اب نہیں
یوں تذکرہ لبوں پہ تو دار و رسن کا ہے

—

تیرگی جن کا مقدر، تیرگی جن کا وجود
وہ چلے تھے روشنی دنیا میں پھیلانے بہت

—

جب کریں گے سرفروشوں کے زمانے تذکرے
منفرد سب میں رہیں گے اپنے افسانے بہت

—

تم ہزار مہکاؤ پھول عقل و دانش کے
جو مرے جنوں میں ہے، بات وہ کہاں پھر بھی

—

نیرنگیٔ مزاجِ زمانہ نہ پوچھئے
شعلے بھی ہاتھ آئے تو اب پھول سے لگے

—

ہم بھی تو اہتمامِ بہاراں میں تھے شریک
پھر آج کیوں تمہاری نظر میں کھٹک گئے

—

یہ ہے دربارِ جمہوری مگر اب تک یہاں یارو
بساطِ اقتدار و طرزِ شاہانہ نہیں اٹھی

اِس مختصر سی تحریر میں حضرت کلیمؔ کی شاعرانہ جہتوں کو پوری تفصیل سے بیان کرنا ممکن نہیں تھا لیکن جہاں تہاں سے کچھ کچھ اُن کے کلام کی کرنوں کو اپنی نوکِ قلم سے چن لیا۔ اور ان کی نرم، دھیمی اور کبھی کبھی تھوڑی سی گرم اور تیز روشنی کو کاغذ پر بکھیر دیا ــــ اب آپ ان سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کیجیے۔

طالبؔ خوندمیری

ایف آئی' آئی' اے ۔ ایم' سی' اے

آرکیٹیکٹ

۵ - ۹ - ۱۱۱۰/۴/اے' روبرو شیر گیٹ

کنگ کوٹھی روڈ - حیدرآباد - ۲۹ (انڈیا)

فون: ۳۲۳۲۶۸۱



صاحبزادہ برہان کلیم
شاعری اور شخصیت

حضرت جگر مراد آبادی کہا کرتے تھے کہ اچھا انسان ہی اچھا شاعر ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی انسان اچھا انسان ہے تو یہ بجائے خود اتنی بڑی بات ہے کہ اس کے شاعر ہونے نہ ہونے سے اس کی اچھائی اور برائی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس مجموعۂ کلام کو آپ اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد جیسے ہی آپ "کچھ اپنے اور کچھ اپنے شعر و سخن کے بارے میں" پڑھیں گے تو آپ کو احساس ہوگا کہ کلیم کس قدر منکسر المزاج انسان ہیں۔ انکسار ایک ایسی صفت ہے جو موجودہ زمانے کے انسانوں میں کم یاب بلکہ نایاب ہوتی جا رہی ہے۔ اس اعلیٰ صفت کے قدر کرنے والے بھی کم ہوتے جا رہے ہیں۔ کلیم بہت ہی پرخلوص اور خاموش الطبع انسان ہیں۔ بہت ہی وضع دار آدمی ہیں۔ آج سے تیس چالیس سال پہلے جس خلوص و محبت سے ملتے تھے، اتنی لمبی مدت گزر جانے کے باوجود وہی انداز قائم و برقرار ہے۔ حضرت صفی اورنگ آبادی نے جھک کے ملنے کو "کرامت" سے تعبیر کیا ہے۔ آج ایسی کرامت رکھنے والے کتنے آدمی ہیں۔ کلیم بھی ایسے ہی گنے چنے

عمر پچاس سال کے قریب ہو چکی ہے۔ وہ کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام جیسا کہ قدیم دستور رہا ہے حمد و نعت سے شروع ہوا ہے۔ اس بات سے بھی ان کی طبیعت کی نیکی اور وضع داری ظاہر ہے۔

کلیمؔ کے مجموعۂ کلام کو میں نے جیسے ہی اپنے ہاتھ میں لیا اور یوں ہی ورق گردانی کرنے لگا میری نظر اس شعر پر رک گئی:

اب تو جو بھی ہنگامہ شہر میں بپا ہوگا
اپنا جرم ناکردہ موجبِ سزا ہوگا

کلیمؔ نے اس شعر میں بڑی خوبی سے حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کیا ہے۔ یہ ان کی شاعری کا امتیازی وصف ہے۔ انہوں نے خواہ مخواہ حسن و عشق کے مضامین نہیں باندھے ہیں۔ انہوں نے "غمِ دوراں" کو بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ موجودہ دَور جمہوریت کا ہے۔ جمہوریت میں تخت نشینی ہوتی ہے نہ "شاہ نشینی"۔ لیکن یہ دَور ایسا ہے جس میں جمہوریت خود "شہ نشینوں" میں گم ہو کر رہ گئی ہے:

آج یہ ہوا ظاہر تیرے ہم نشینوں سے
حسنِ تختِ جمہوری گم ہے شہ نشینوں سے

جمہوری نظام پر ایک اور شعر میں طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

جلوہ گاہِ شامِ غم ہیں ہم غریبوں کے مکاں
شمعِ جمہوری مگر روشن ہے ایوانوں کے پاس

اِسی وجہ سے کسی نے کہا ہے کہ ہمارے ہاں

A GOVERNMENT OF THE PEOPLE IS BY THE PEOPLE FOR THE PEOPLE.

آدمیوں میں سے ایک ہیں۔

کلیمؔ سے ہمارے خاندانی روابط رہے ہیں۔ ان کے والد صاحبزادہ نواب میر دلدار علی خاں افسر (کانے نواب) مرحوم سے میرے دادا حضرت تمکین سرمست مرحوم اور میرے چچا باوا حضرت عبدالقادر مرحوم کے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ میں بھی اپنے والد کے ساتھ ان کی ڈیوڑھی میں گیا ہوں۔ اس کا بڑا ہی شاندار پھاٹک تھا۔ اتنے اونچے اور بڑے دروازے کے سامنے ایر انڈیا کے بونوں کی طرح گویا "خوش آمدید" کہنے کے لیے بونے رہا کرتے تھے۔ جو لوگ میر عالم منڈی کے عقبی راستے سے گزرے ہیں، مجھے یقین ہے کہ وہ بونے انہیں اب تک یاد ہوں گے۔

برہان علی خاں کلیمؔ کو شعر و شاعری کا ذوق وراثت میں ملا ہے۔ نہ صرف ان کے والد صاحب قبلہ شاعر تھے، ان کے بھائی بھی شاعر تھے۔ والد صاحب مرحوم اور دلدار چچا میں علاوہ اور باتوں کے قدر مشترک شاعری بھی تھی۔ میرے بھی تمام چچا شاعر تھے۔ یہ تمام محترم بزرگ جو شاعری کرتے تھے اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانے میں شاعری، علم و فضل کا درجہ رکھتی تھی۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے اپنی کتاب "دلّی کا دبستانِ شاعری" میں لکھا ہے :-

> "جہاں تک شعر و شاعری کا تعلق ہے، یہ فن یا ہنر یا علم سمجھا جاتا تھا، جو صرف پڑھے لکھے اور عالم فاضل لوگوں کے بس کا تھا۔ شاعری دوسرے الفاظ میں ایک معیارِ قابلیت تھی یعنی قابلیت کا بہترین اظہار شاعری کو مانا جاتا تھا۔"

کلیمؔ ایک اچھے انسان ہیں، اس لیے ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ اِن کی شاعری کی

لیکن اصل میں یوں ہے :۔

A GOVERNMENT "OFF" THE PEOPLE IS "BUY" THE PEOPLE "FAR" THE PEOPLE.

چونکہ جمہوریت میں آج عوام کی اہمیت نہیں رہی ہے۔ کیونکہ انہیں خریدا جاتا ہے اور اسی وجہ سے یہ جمہوریت عوام سے دور بھی ہے۔ اس لیے کہ موجودہ دور میں کسی منزل سے عشق نہیں رہا ہے اور جب عشق ہی نہ ہو "شانِ جنوں" کہاں پیدا ہو سکتی ہے اور جب "شانِ جنوں" ہی نہیں رہتی تو "دار و رسن" کی بات زبانی جمع خرچ کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتی :

کیا بات ہے کہ شانِ جنوں ہم میں اب نہیں
یوں تذکرہ تو ہونٹوں پہ دار و رسن کا ہے

موجودہ زندگی کے مختلف مظاہر پر کلیمؔ کی نظر گہری ہے۔ آج ترکِ وطن عام ہے ہر گھر کا کوئی نہ کوئی فرد باہر ہے۔ یہ صرف "فکرِ معاش" کے لیے ہے یا کچھ اور؟ اس کا جواب کلیمؔ کی زبانی سنیئے :

لطفِ تعیشات کا شوقِ طلب ہے عام
فکرِ معاش کے لیے ترکِ وطن بھی جھوٹ

زندگی کے عام مشاہدات اور تجربات کو کلیمؔ شعر کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ زندگی کی صداقتوں کو وہ شاعرانہ انداز میں بیان کر دیتے ہیں۔ پہلے کے قائد صلیبیں اٹھا کر چلتے تھے اور دار و رسن کی آزمائش سے گزرتے تھے لیکن آج قائدین کی دار و رسن سے نسبت جھوٹ بن کر رہ گئی ہے :۔

وہ دن گئے کہ جب تھی قیادت صلیب سے
اب قائدوں سے نسبت دار و رسن بھی جھوٹ

"یارِ بے تکلّف" کب اور کس طرح "عذاب" بن جاتا ہے؟ کلیمؔ اس کو بیان کرتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ مہذب افراد کے لیے بے موقع بے تکلفی کس قدر گراں گزرتی ہے :

اِک عذابِ محفل ہے یارِ بے تکلّف بھی
ہم سے اس کا "تو" کہہ کر محوِ گفتگو ہونا

کلیمؔ کے مزاج میں جو توازن ہے وہ ان کی شاعری میں بھی ہر جگہ نمایاں ہوتا ہے۔ وہ زندگی کی صالح قدروں کو عزیز رکھتے ہیں۔ یہ قدریں بہت تیزی سے ماضی کا ورثہ بنتی جارہی ہیں۔ اسی وجہ سے ایسے افراد جو ماضی سے بھی گہرا رشتہ رکھتے ہیں، انہیں ماضی پرست کہا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے کلیمؔ ان غلط اندیشیوں کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ماضی کے احترام کی وجہ سے یہ سمجھ لینا نہیں چاہیے کہ ایسے اصحاب میں روایت شکنی نہیں ہوتی ۔

یہ سچ نہیں کہ روایت شکن نہیں ہم لوگ
مگر یہ سچ ہے کہ ماضی کا احترام بھی ہے

کلیمؔ کی شاعری کا یہی انداز ان کے مجموعۂ کلام کو وقیع بناتا ہے۔ انہوں نے زندگی کی بہت سی صداقتوں کو شاعرانہ سلیقے سے بیان کیا ہے۔ میں اپنے دیرینہ ساتھی اور دوست کو اس مجموعۂ کلام کی اشاعت پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کا یہ مجموعۂ کلام ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

پروفیسر ڈاکٹر یوسف سرمست (ریٹائرڈ)
"کتعان" ۸-۲-۶۲۹/۱/۷
روڈ نمبر ۱۲، بنجارہ ہلز۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۳۴

کچھ اپنے اور کچھ اپنے شعر و سخن کے بارے میں!!

عجب پابندِ رضا بنا ہوا ہوں، عجب کشمکش و آزمائش میں پھنسا ہوا ہوں!۔
آپ سے، قارئین کرام سے آپ ہی آپ متعارف ہو جاؤں! یعنی اپنی ذات، اپنی شخصیت کے تعلق سے خود اپنے ہی قلم سے لکھوں، خود اپنی ہی زبان سے لاف زنی کروں اور آپ اپنا میاں مٹھو کہلاؤں۔ لیکن نہ جائے رفتن، نہ پائے ماندن والی بات ہے اور میں سوچنے لگا ہوں کہ ــــ

میں کیا! ــــ

میری شاعری کیا!! ــــ

اور ــــ

اس کی حکایت و حقیقت ہی کیا!!! ــــ

پھر بھی! ــــ کچھ نہ کچھ کہنے کی، کچھ اپنی شاعری کی، کچھ اپنی خاندانی سلسلے کی کڑی دکھلانے کی مخلص احباب کی طرف سے بہت کڑی شرط عائد ہے۔ اس لیے عرض ہے کہ

میں ناچیز، حقیر، پُرتقصیر سابقہ شاہانِ آصفیہ حیدر آباد کے خاندان کا ایک فرد ہوں۔ حضرت مغفرت مآب آصف جاہ اوّل کی اولادِ صُلبی سے تعلق رکھتا ہوں اور اس زمانے کی خوش نصیبی اور اس زمانے کی بدنصیبی سے صاحبزادہ یا معیت زادہ

کہلاتا ہوں ــــ میرے والد صاحبزادہ میر دلدار علی خاں افسر المعروف کالے نواب صاحب قبلہ مرحوم اور میرے حقیقی بڑے بھائی صاحبزادہ میر حیدر علی خاں نعیم مرحوم دونوں شاعر تھے۔ میرے بڑے بھائی اکثر و بیشتر ہماری دیوڑھی میں ادبی، علمی اور موسیقی کی محفلیں منعقد کیا کرتے تھے۔ انہی علمی و ادبی صحبتوں کا اثر تھا کہ بچپن سے ہی میرے ذہن میں کچھ الٹے سیدھے مصرعے ابھرتے ڈوبتے رہتے اور وہ شائد ۱۹۴۳ء کا زمانہ تھا جبکہ میں جماعت چہارم کا طالب علم تھا میں نے دو چار آلٹی سیدھی غزلیں کہہ ڈالی۔ ابتدا میں تو میں نے چند غزلیں بھائی صاحب قبلہ کو دکھلائیں اور کچھ دنوں یہ سلسلہ جاری بھی رہا، پھر میں نے اُن سے اصلاح لینی بند کر دی۔ کیونکہ میرے اور ان کے درمیان حسب خاندانی روایات، حدودِ آداب و تہذیب مانع ہوتے تھے۔ میں کھل کر ان سے اپنی خامیوں پر بحث و تکرار نہیں کر سکتا تھا اور بغیر سمجھے بوجھے بلا چوں و چرا زیادہ سے زیادہ اصلاح لینا میری خود دار طبیعت نے گوارا نہ کیا۔ لیکن میری طبعِ جولاں نچلی نہیں بیٹھ سکی۔ اپنے طور پر فکرِ سخن کا سلسلہ برابر جاری رکھے ہوئے تھا۔ ہماری دیوڑھی کے اکثر و بیشتر مشاعروں میں اپنے دوستوں کی چھوٹی موٹی محفلوں میں اپنی غزلیں جن پر مجھے بھرپور اعتماد ہوتا تھا سُنا دیا کرتا۔ حتی کہ جب میں نے میٹرک اور انٹر پاس کر کے عثمانیہ یونیورسٹی میں گریجویشن کے لیے داخلہ لیا تو وہاں کی ادبی محفلوں میں بھی حصہ لیتا اور کبھی کبھی داد و تحسین بھی حاصل کر لیا کرتا۔ اس وقت کے ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ اردو پروفیسر حضرت عبدالقادر سروری صاحب کے ارشاد پر اُن کے گھر پر منعقدہ محفلوں میں بھی جن میں تنقید و تبصرہ بھی ہوا

کرتا تھا۔ میں نے اپنی غزلیں بھی سنائیں جہاں ڈاکٹر زور صاحب ڈاکٹر حفیظ قتیل صاحب، لیکچرر جناب حمید الدین شاہد صاحب، شاعر جناب شاہد صدیقی مرحوم سکندر توفیق اور جناب ڈاکٹر وحید اختر جو اس وقت عثمانیہ کے طالبِ علم تھے، موجود ہوتے تھے۔ کبھی کبھی مخدوم بھی شریک ہو جاتے۔ بڑی مخصوص محفل ہوتی تھی۔ اِن اصحاب و اساتذہ کے داد و تحسین اور تنقید و تبصروں سے بہت فیضان حاصل ہوا۔ یونیورسٹی میں ڈاکٹر وحید اختر جو اس وقت مجلۂ عثمانیہ کے ایڈیٹر بھی تھے اور حفیظ قتیل صاحب میری بہت ہمت بڑھاتے رہے۔ ۱۹۵۴ء، ۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۹ء میں مجلۂ عثمانیہ کے شماروں میں میری غزلیں بھی چھپیں۔ اور پھر بھی! اس تمام اثنا میں میری شاعری بغیر اصلاح کے شترِ بے مہار ہی بنی رہی۔ اور جب یونیورسٹی چھٹ گئی میں نے ۱۹۵۵ء میں گریجویشن کرلیا تو والد صاحب قبلہ کی رائے اور ایما پر حضرت نواب قادر الدین احمد تمکین سرمست سے جو میرے والد کے قدیم بے تکلف دوستوں میں تھے، باضابطہ شاگردی کے لیے رجوع ہوا۔ تمکین چچا کا طریقۂ اصلاح و مشورہ مجھے بہت بھایا اور دل کو لگا۔ اُن کی ہمت افزائی اور زور دینے پر میں نے جناب نیاز فتح پوری کے ماہنامہ "نگار" لکھنؤ کو دو غزلیں بھیجیں جو الحمدللہ میری غزلیں اس میں بھی چھپیں۔ لیکن بدقسمتی سے یہ سلسلہ پانچ غزلوں اور ایک نظم سے زیادہ قائم نہ رہ سکا۔ پھر وہ شفقت سے بھرپور مہربان ہستی حضرت تمکین چچا کی بے وقت موت کی وجہ سے بہترین رہنمائی کی کڑی بھی ٹوٹ گئی۔

چند دنوں بعد میں خیرات ندیم صاحب سے متعارف ہوا، رجوع ہوا۔
ان کے یہاں ادبی، علمی محفلیں روز مرہ اکثر آتی تھیں، بڑی دلچسپ [illegible] اور معلوماتی محفلیں ہوتیں۔

بحث، مباحثے ہوتے، حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ بھی ہوتے۔ جناب امیر احمد خسرو صاحب، حضرت سعید شہیدی
حضرت ڈاکٹر علی احمد جلیلی صاحب، عابد انصاری صاحب، آنجہانی سرینواس
لاہوٹی، جناب شاذ تمکنت، صاحبزادہ میر اعظم علی خاں اعظم، روشن خیال
صاحب اور ستار صدیقی صاحب وغیرہ شامل رہتے تھے۔ ندیم صاحب
کی بذلہ سنجی اور لطیفوں سے پوری محفل زعفران زار بن جاتی۔ میں نے
حضرت سعید شہیدی اور حضرت ڈاکٹر علی احمد جلیلی صاحب سے بہت اچھا استفادہ
کیا۔ اور میں اِن شفیق و مہربان ہستیوں کا بالخصوص علی احمد جلیلی صاحب (علی بھائی)
کا بے حد ممنون و مشکور ہوں کہ انہوں نے ازراہِ نوازش میرے مجموعۂ کلام پر
ایک بار نظرِ ثانی کی اور اس کی طباعت و اشاعت کے لیے مفید مشوروں سے نوازا۔
میں اِن تمام اصحاب، ساتھیوں اور قریبی احباب کا، خاص طور پر اپنے بہت ہی
پرانے قریبی دوست جناب خواجہ بہاء الدین صاحب میوزک کمپوزیٹر اور جناب
خواجہ معین الدین صاحب سابق پرسنل سکریٹری ٹو چیف منسٹر (آنجہانی شری ٹی انجیا)
کا بے حد ممنون و مشکور ہوں جن کی بے لوث کوششوں، بے انتہا خلوص، محنت اور
مدد سے یہ مجموعۂ کلام منظرِ عام پر آسکا۔ احسان فراموشی ہوگی اگر میں محمد سردر
سلطان صاحب، صاحبزادہ اعظم، محمد نور اللہ شریف مرحوم اور روشن خیال صاحب مرحوم
کا بھی ممنون نہ ہونگا جنہوں نے اس سلسلہ میں میرا ہاتھ بٹایا۔

ایک بات اور یہ بھی کہ میں اپنی شاعری کے علاوہ ایک زمانے تک
افسانے بھی کلیم صدیقی کے قلمی نام سے لکھتا رہا ہوں اور اس عرصہ میں میرے اکثر
بیشتر افسانے اور غزلیں کئی رسائل، جریدے، ماہنامے اور روزناموں میں
شائع ہوتے رہے ہیں۔ جن میں قابلِ ذکر روزنامہ ملاپ حیدرآباد، روزنامہ سیاست

حیدرآباد، روزنامہ منصف حیدرآباد، روزنامہ سالار بنگلور، ماہنامہ صبا حیدرآباد، ماہنامہ بیسویں صدی نئی دہلی، ماہنامہ روبی نئی دہلی، ماہنامہ ساز کلکتہ، ماہنامہ پونم حیدرآباد، ماہنامہ خاتون دکن حیدرآباد، ماہنامہ اِنشا کلکتہ، ماہنامہ گلبانگِ ادب بمبئی، ماہنامہ فلمی تصویر حیدرآباد، ماہنامہ مغربی بنگال (گورنمنٹ آف مغربی بنگال) کمیونسٹ ہفت روزہ حیات نئی دہلی، ماہنامہ نقاش بمبئی، ماہنامہ قومی راج بمبئی (گورنمنٹ مہاراشٹرا) ماہنامہ آندھرا پردیش (گورنمنٹ آندھرا) اور اورنگ آباد ٹائمز وغیرہ ہیں۔ اِن کے علاوہ ٹی وی دوردرشن سے میرے گیت اور غزلیں جناب بہاء الدین کے ساز اور آواز میں کئی بار سنائے گئے۔

اب رہ گیا میرے فکر و فن، میرے شعر و سخن کے تعلق سے تو..... یہاں صرف بقول جناب سکندر علی وجد مرحوم کا حوالہ دے کر گلو خلاصی کرتا ہوں۔

حریمِ علم کا شام سحر طواف کیا
سخن کو زنگِ نقائص سے پاک صاف کیا
رہِ وفا سے سرِ مو نہ انحراف کیا
خوشی سے اپنی خطاؤں کا اعتراف کیا
زبانِ خار سے شبنم کی بوند چن لی ہے
ہوا قصور تو دشمن کی بات سن لی ہے

" جواہراتِ تخیل ہیں امتحاں کے لیے "
" صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے "

پتہ:
"بیت المقدر" نمبر ۲۳۸-۷-۲۲
اندرون دیوڑھی باقر نواز جنگ
پرانی حویلی۔ حیدرآباد

ناچیز: صاحبزادہ میر برہان علیخاں کلیم بی اے (عثمانیہ)
[illegible]

قطعہ

اے دیدۂ نقاد میں لڑیوں میں پرو کر
جذبات کے اور فکر کے لایا ہوں گہر دیکھ

میں کون ہوں اور کیا ہوں نہ کر غور تو اس پر
جو شعر کے سانچے میں ڈھلی ہے وہ نظر دیکھ

(کلیم)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

زُلفِ غزل (غزلیں)

غزل نمبر | صفحہ نمبر

"یارِ بے تکلّف" کب اور کس طرح "عذاب" بن جاتا ہے؟ کلیمؔ اس کو بیان کرتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ مہذب افراد کے لیے بے موقع بے تکلفی کس قدر گراں گزرتی ہے:

اِک عذابِ محفل ہے یارِ بے تکلّف بھی
ہم سے اس کا "تو" کہہ کر محوِ گفتگو ہونا

کلیمؔ کے مزاج میں جو توازن ہے وہ ان کی شاعری میں بھی ہر جگہ نمایاں ہوتا ہے۔ وہ زندگی کی صالح قدروں کو عزیز رکھتے ہیں۔ یہ قدریں بہت تیزی سے ماضی کا درثہ بنتی جارہی ہیں۔ اسی وجہ سے ایسے افراد جو ماضی سے بھی گہرا رشتہ رکھتے ہیں، انہیں ماضی پرست کہا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے کلیمؔ ان غلط اندیشیوں کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ماضی کے احترام کی وجہ سے یہ سمجھ لینا نہیں چاہیے کہ ایسے اصحاب میں روایت شکنی نہیں ہوتی۔

یہ سچ نہیں کہ روایت شکن نہیں ہم لوگ
مگر یہ سچ ہے کہ ماضی کا احترام بھی ہے

کلیمؔ کی شاعری کا یہی انداز ان کے مجموعۂ کلام کو وقیع بناتا ہے۔ انہوں نے زندگی کی بہت سی صداقتوں کو شاعرانہ سلیقے سے بیان کیا ہے۔ میں اپنے دیرینہ ساتھی اور دوست کو اس مجموعۂ کلام کی اشاعت پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کا یہ مجموعۂ کلام ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

پروفیسر ڈاکٹر یوسف سرمست (ریٹائرڈ)
"کنعان" ۸-۲-۶۲۹/۱/۷
روڈ نمبر ۱۲، بنجارہ ہلز۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۳۴

دَورِ اربع

قطعات

عروسِ فکرِ غزل



رقصِ ناتمام

نغمۂ توحید سازِ ایماں پر

(حمد و ثنائے باری تعالیٰ)

ہم پُرخطا ہیں اور سزا کے ہیں مستحق
تو رحمتِ تمام غفور الرحیم ہے

حمد و ثنائے باری تعالیٰ



وردِ زبانِ عام غفور الرّحیم ہے
یوں ذکرِ صبح و شام غفور الرّحیم ہے

میرے نصیب چشم کرم گر کرے قبول
نذرانہ یہ کلام غفور الرّحیم ہے

ہو میکدہ کہ خانقاہ دونوں جہان میں
مشہور تیرا نام غفور الرّحیم ہے

کافر پہ مشرکوں پہ بھی لطف و کرم تیرا
کیا تیرا فیضِ عام غفور الرّحیم ہے

ہم پُر خطا ہیں اور سزا کے ہیں مستحق
تو رحمتِ تمام غفور الرّحیم ہے

عادِل ہے پُرجلال ہے تو جانتے ہیں ہم
بخشش بھی تیرا کام غفور الرّحیم ہے

باطل کے مقتلوں میں ترے اہلِ حق پہ آج
تلوار بے نیام غفور الرّحیم ہے

بس اِک نظر ہو نورِ رسالت کا واسطہ
تاریک ہے اپنی شام غفور الرّحیم ہے

صدقے میں کیفِ میکدہ طور کے کلیمؔ
پھر ملتجی ہے جام غفور الرّحیم ہے

●

بہارِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم

(عقیدت و محبت کی گل کاریاں)

٭

لیجے قبول نذرِ کلیم آپ یا حضور
صاحب نگاہ جوہرِ فن آپ ہی تو ہیں

کلیمؔ

نعتِ حضورؐ

توحید کی بہارِ چمن آپ ہی تو ہیں
ایمان کے گلاب کا بَن آپ ہی تو ہیں

کلماتِ حق سے جس کی فضائیں ہیں مشکبار
اُس باغ کی شمیمِ سخن آپ ہی تو ہیں

گرما دیا ہے جس نے لہو کائنات کا
بے شک وہ آفتاب بدن آپ ہی تو ہیں

سنگریزے پڑھ کے رو برو کلمہ ہیں سرخرو
ہاں شاہدِ عقیقِ یمن آپ ہی تو ہیں

گنجینۂ کمال سراپائے معجزات
نورِ مبین چاند شکن آپ ہی تو ہیں

وعدہ خدا سے لینے بفد ہیں دمِ آخر
اُمّت کی عافیت کا جتن آپ ہی تو ہیں

چھایا ہوا سا رہتا ہے دل پر جو صبح شام
اُس عشق کی زمیں کا گگن آپ ہی تو ہیں

بہرِ سفارشات قیامت کی دھوپ میں
ہم عاصیوں پہ سایہ فگن آپ ہی تو ہیں

ہر غمکدہ کی تیرگی کو نور بخشنے
ہر مسکراتی رُخ کی کرن آپ ہی تو ہیں

کیجے قبول نذرِ کلیمؔ آپ یا حضورؐ
صاحب نگاہ جوہرِ فن آپ ہی تو ہیں



وعدہ خدا سے لینے بضد ہیں دمِ آخر
اُمّت کی عافیت کا جتن آپ ہی تو ہیں

چھایا ہوا سا رہتا ہے دل پر جو صبح و شام
اُس عشق کی زمیں کا گگن آپ ہی تو ہیں

بہرِ سفارشات قیامت کی دھوپ میں
ہم عاصیوں پہ سایہ فگن آپ ہی تو ہیں

ہر غمکدہ کی تیرگی کو نور بخشنے
ہر مسکراتی رُخ کی کرن آپ ہی تو ہیں

کیجے قبول نذرِ کلیمؔ آپ یا حضورؐ
صاحب نگاہ، جوہرِ فن آپ ہی تو ہیں

●

نعتِ حضورِ صلعم

پہونچی نہیں بتائیے وہ رد شنی کہاں
محدود ذاتِ رحمتِ عالم ہوئی کہاں

بے بال و پر حیات انہیں سے اُڑی کہاں
حدِ تعینات بتا تو رہی کہاں

"بعد از خدا بزرگ" پہ تو رُک گیا قلم
شایانِ شان اُن کے اب الفاظ ہی کہاں

اِک عمر یوں تو دِل کی تمنا رہی مگر
نعتِ حضورؐ کہنے کی ہمت ہوئی کہاں

یہ ہے زمینِ نعت، لحاظِ ادب رہے
تلوار زیرِ پا ہے، رہِ بے خودی کہاں

قرآن، اتباعِ نبیؐ، حبِ اہلِ بیت
اُن کے بغیر عشق کی منزل ملی کہاں

شمس الضحیٰ بھی جو ہیں، جو بدر الدجیٰ بھی ہیں
نبیوں میں دو جہاں کے ہے اُن سا نبی کہاں

مخلص نہیں جو عشق میں اُس کے نصیب میں
دیدارِ آستانۂ نورِ نبیؐ کہاں ؟

وابستگانِ شافعِ محشر سے ہوں کلیمؔ
میں خاکِ پا کہاں، میری قسمت لڑی کہاں

●

نعتِ شریفؐ

جلوۂ محمدؐ کے لطف ہی نرالے ہیں
عرش سے زمینوں تک روشنی کے ہالے ہیں

گیسوئے معطر ہیں چہرۂ منور ہیں
سُرمئی دھندلکے ہیں یا کہ چمپئی اُجالے ہیں

ذہن و فکر و کاوش سے ماورٰی ہے ذات اُنکی
بند شوں میں لفظوں کی کب وہ آنے والے ہیں

آندھیاں زمانے کی کیا ہمیں ڈرائیں گی
سرورِ دو عالمؐ کی رحمتوں کے پالے ہیں

بے نیازِ جنّت ہم بے نیازِ دوزخ ہم
آپ ہی کے سائے میں ہم تو رہنے والے ہیں

پُر خطا ہیں ہم بے شک بے وفا نہیں لیکن
آپ سے ہیں وابستہ آپ کے حوالے ہیں

جب ہیں شافعِ محشر ساتھ اے کلیمؔ اپنے
فکر کیا جو پرسش سے ہم گزرنے والے ہیں



نعتِ حضور صلعم

بس اِک چشمِ کرم کے ہوں اشارے یارسول اللہ
ہم اہلِ غم زمانے کے ہیں مارے یارسول اللہ

زمیں تنگ، آسماں دشمن، نگاہِ وقت ہے خنجر
ہمیں رحمت کے مِل جائیں سہارے یارسول اللہ

بہت رسوائے عالم ہیں سرِ تسلیم خم لیکن
بُرے ہیں یا بھلے ہم ہیں تمہارے یارسول اللہ

دمِ آخر ہے لب پر نام آن کا بھیج دے یارب
مریضانِ غمِ دوراں پکارے یارسول اللہ

زیارت گاہِ عالم کیوں نہ پھر روضہ تمہارا ہو
کہ تم ہو خالقِ عالم کے پیارے یارسول اللہ

سلامت ہے جو یہ اُمّت تمہاری دَورِ طوفاں میں
تصرّف یہ کرم کا ہے تمہارے یارسول اللہ

تجلّی صبحِ رُخ کی ہو کلیمِ خستہ جاں پر بھی
شبِ ظلمت میں دن اس نے گزارے یارسول اللہ



نعتِ حضور صلعم

رحمتِ محمدؐ پر جب سدا نظر رکھوں
وقت جیسے ظالم کا کیوں میں دل میں ڈر رکھوں

یہ کرم بھی کیا کم ہے ایسی آندھیوں میں بھی
شہرِ بے چراغاں میں روشنی کا گھر رکھوں

اس قدم کا کیا کہنا عرش پر جو پہنچا ہے
کاش ! وہ قدم چوموں اس قدم پہ سر رکھوں

عشق چھائے یوں دل پر یا خدا احمدؐ کا !
میں خودی سے خود اپنی خود کو بے خبر رکھوں

زندگی کی راہوں میں غم کی لمبی راتوں میں
اُن کے نقشِ پا کو میں مشعلِ سفر رکھوں

چوم کر صبا آئی گیسوئے نبیؐ شاید
کیوں نہ آس کی راہوں میں دل کا ہر شجر رکھوں

ہے نبیؐ دمِ آخر مجھ کلیمؔ کی حسرت
تم ہو سامنے میرے تم پہ ہی نظر رکھوں



"بے نقط"

نعتِ حضورِ سرورِ عالم ؐ

عطائے مدعا کا واسطہ ہے سرورِ عالم ؐ
دُعاؤں کی رسائی کا سرا ہے سرورِ عالم ؐ

مہک حمد و محمد ؐ کی رہی ہے "م" کے گُل سے
کہ "اللہ احد" کا گُل کدہ ہے سرورِ عالم ؐ

صدائے رُوحِ محرومی کو، ہم سے آس والوں کو
مرادِ کاسۂ دِل کی عطا ہے سرورِ عالم ؐ

وہی دَور سَلاسِل ہے وہی کردارِ اعدا ہے
وہی رحم و کرم کا سلسلہ ہے سرورِ عالم ؐ

ہوائے گرم و سردِ دہر ہو آلام و حرماں ہوں
مُداوا ہے ہمارا، آسرا ہے سرورِ عالم ؐ

ڈرائے کس طرح ہم کو حصارِ صدمۂ دوراں
دِلوں کا ولولہ ہے حوصلہ ہے سرورِ عالم

دُکھوں کے دَرد کے صحرا کی ہر دَورِ اداسی کی
تشکھوں کی ہلکی ہلکی سی ہوک ہے سرورِ عالم

وہ اوروں کے دِلوں کا اور کوئی آسرا ہوگا
ہمارا مالکِ ہر دوسرا ہے سرورِ عالم

طلوعِ ماہِ کامل سے ہو طے راہِ عدم ساری
مری عمرِ رواں کا مدّعا ہے سرورِ عالم

●

نعتیہ ٹھمری

مدینہ میں یا رب ہم اِس طرح آئیں
کہ روضہ پہ اشکوں کے موتی چڑھائیں
حضور اپنی پیشی میں جس دم بلائیں
تو رحمت کی باہوں میں دم توڑ جائیں

آؤ آؤ چلو ری سکھی موہے پیا کی نگریا

وہ پُر نور چوکھٹ وہ جگ مگ منارے
بھرے مانگ میں جیسے چندا ستارے
اُسی کے ہیں جلوؤں کے روشن نظارے
کرم اس کے ہیں سارے جگ سے نیارے

دیکھو دیکھو ہے سورگ کی سی اُس کی سندر ڈگریا
آؤ آؤ چلو ری سکھی موہے پیا کی نگریا

جہاں سر جھکائے ہوئے دو جہاں ہیں
جہاں اُس کی رحمت کی ندیاں رواں ہیں
فرشتوں کے بندوں کے جمگھٹ جہاں ہیں
خزانے عقیدت کے لٹتے جہاں ہیں

بنالوں گی میں لیکے خاکِ حرم موئے ماتھے کی بندیا
آؤ آؤ چلو ری سکھی موئے پیا کی نگریا

پیا کی نگریا میں دھونی رما کے
تن اپنا من اپنا سبھی کچھ لٹا کے
مدینے کے ساگر کی پنگھٹ پہ جا کے
وہاں پریم کی مدرا سے مٹکی بھرا کے

کلیمؔ اپنے پاپوں کی دھوؤں گی میلی چندریا
آؤ آؤ چلو ری سکھی موئے پیا کی نگریا

●

رُباعی

فرمودہ از باب العلوم مولائے کائنات حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ



فَاِنَّ الْعِلْمَ لِلْاَشْرَافِ شَرَفًا
وَفِی الْاَجْلَافِ مُقْبُوضًا وَذَمًّا
كَاَنَّ الْمَاءَ فِی الْاَصْدَافِ دُرًّا
وَفِی الْاَفَاعِیْ سَارَ اَسَمًّا

• •

ترجمہ

پاتا شرف عظیم ہے ہر علم سے بشر
حق میں کمینگی ہے کمینوں کے یہ مگر
منہ میں صدف کے قطرۂ نیساں گہر بنا
اور منہ میں سانپ کے یہ ہوا زہر پر اثر

(کلیم)

منقبت

حضرت سیّدنا علی شیرِ خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ

قطعہ

مولا ہیں کائنات کے مشکل کشا علیؓ
دافع ہیں مشکلات کے مشکل کشا علیؓ
ہم اہلِ پُر خلوص کے حق میں تو اے کلیم
یاور ہیں حادثات کے مشکل کشا علیؓ

(دیگر)

شیریں زباں لیے ہوئے ڈستا ہے آج بھی
ہر سانپ زہرِ علم کا مولائے کائنات
اس دورِ گمرہی میں بھی ہم پر کھلا ہے
ہر باب شہرِ علم کا مولائے کائنات

●

سلام

سوچو حدیثِ غم کا فسانہ ہے کربلا
آفاقیت میں دیکھو تو کیا کیا ہے کربلا

یہ واقعہ ہی حشر بداماں ہے حشر تک
قربانیوں کی بھیڑ میں تنہا ہے کربلا

اہلِ گماں تو مسئلۂ شرک میں ہیں گم
"اہلِ یقیں کے واسطے کعبہ ہے کربلا"

اہلِ طلب کا ظلمتِ باطل میں آج بھی
دریائے نورِ حق کا کنارا ہے کربلا

حرؔ بھی ہے حرملہ بھی ہے اپنا بھی غیر بھی
ہر رُخ کا جیسے آئینہ خانہ ہے کربلا

کیفِ نگاہِ ساقیٔ کوثر کی ہے قسم
تشنہ لبانِ شوق کا چشمہ ہے کربلا

ہر زخم ہے حسینؑ کا جنت کا ہر گلاب
خوشبو سے جن کی اب بھی مہکتا ہے کربلا

ہم اہلِ شامِ غم پہ بھی بس اک نظر حسینؑ
صدقے میں اُس کے جس سے مجلّٰی ہے کربلا

اہلِ عزا کی چشمِ عقیدت کا اے کلیمؔ
خاکِ شفا ہے طور کا سرمہ ہے کربلا

●

منقبت

حضرت سیدنا غوث اعظم دستگیرؒ

قطعہ

•

یا امیرِ اولیا یا غوثِ اعظم دستگیرؒ
اِس طرف بھی کچھ کرم فرمائیں یا پیرانِ پیر
اُف! یہ شامِ غم یہ ظلمت اور کلیمِ خستہ جاں
اِک تجلّی، اِک نظر ایسے میں یا روشن ضمیر

•

زُلفِ غزل

غزلیں

قدریں بھی، حوصلے بھی، مسائل بھی، عشق بھی
زلفِ غزل سجاتے ہیں کس بانکپن سے ہم!

تیری زُلفوں کی ہوائیں جب بھی لہراتی رہیں
خاک میں سوئے ہوئے شعلوں کو بھڑکاتی رہیں

آندھیوں پہ آندھیاں ہر دَور میں آتی رہیں
جرأتیں اپنی مگر تاریخ دُہراتی رہیں

ہر طرف رنگِ خزاں تھا باغِ ہستی میں مگر
شوق کی گُل کاریاں زخموں کو مہکاتی رہیں

تجربوں کی چلچلاتی دھوپ غم کی وادیاں
کتنے برفیلے شعور و فکر پگھلاتی رہیں

کچھ حسیں الفاظ کی پریاں سی بزمِ ناز کی
ذہن کے جھولے میں جیسے جھولتی گاتی رہیں

کچھ کرم آمیز نظریں شوخ کرنوں کی طرح
ساغروں سے آتشِ سیال چھلکاتی رہیں

تیغِ خوں آشام، لاشیں، نفرتوں کی راہ میں
ہم کو تیرے شہر کی تصویر دکھلاتی رہیں

دِل شکن تھیں ظلمتیں کتنی مگر آہیں میری
زندگی کی مشعلیں ہر گام سلگاتی رہیں

شامِ غم پرچھائیاں سی سازِ ارماں پر کلیم
میرے سپنوں کے کھنڈر میں رقص فرماتی رہیں

●

بانسری کی لَے یہ یادوں کی مچلتے بھی رہے
اشک بن بن کر نگاہوں سے وہ ڈھلتے بھی رہے

لڑکھڑاتے بھی رہے پیہم سنبھلتے بھی رہے
عمر بھر ہم حادثوں کے ساتھ چلتے بھی رہے

دیر تک تھا زورِ طوفانِ غمِ ہستی مگر !
دیر تک وہ ساحلِ دل پر ٹہلتے بھی رہے

دیدہ و دل ایک دوشیزہ کے سپنوں کی طرح
انتظارِ موسمِ گُل سے بہلتے بھی رہے

یوں تو یکجہتی کے تھے سب ہی کے ہونٹوں پر پیام
آستینوں سے مگر خنجر نکلتے بھی رہے

غم وہی، دنیا وہی، قصہ وہی، عنواں وہی
لیکن اندازِ ستم اُن کے بدلتے بھی رہے

زیست کے کچھ مرحلے، کچھ وقت کے بے رحم ہاتھ
شاخِ دل کی ادھ کھِلی کلیاں مسلتے بھی رہے

فن کو دے دے کر لہو دل کا، ہجومِ شوق میں
ہم شبِ غم شمع کی مانند جلتے بھی رہے

پُرخلوص انداز میں نمازِ سینوں میں کلیمؔ
آستینوں میں کچھ ایسے سانپ پلتے بھی رہے



تصویرِ یار شیشۂ دِل پر اُتار کے
چلتا ہوں ساتھ ساتھ غمِ روزگار کے

اے وقت ہم سے بھی کبھی نظریں ملا کے دیکھ
ہم بھی ہیں آزمائے ہوئے چشمِ یار کے

جھلکے ہیں آبگینوں سے کچھ رنگ اس طرح
جیسے حروف پانی پہ لکھے ہوں پیار کے

میرا خلوص دیکھئے کھا کر فریبِ دوست
مہکا رہا ہوں پھول دلِ داغدار کے

لطفِ تجلّیاتِ زمانہ نہ پوچھئے!
سورج کو گھیرنے لگے پتلے غبار کے

یوں تو ہر ایک موسمِ گُلشن تھا گرم و سرد
اب کے عجیب رنگ ہیں موجِ بہار کے

کب تک کروں میں چاندنی راتوں کا انتظار
آجاؤ اپنا چاند سا مکھڑا نکھار کے

اصرارِ دیدِ یار گنہ تھا مگر حلیمؔ
صدقے نزولِ رحمتِ پروردگار کے



غمِ دوراں کی راہوں میں حسیں آنچل جو لہرائے
بتائیں کیا تمہارے جَور ہم کو کتنے یاد آئے

محبّت میں کچھ ایسے بھی کبھی اُن کے جواب آئے
بھگو کر آنسوؤں میں خط ہمارے ہم کو لوٹائے

کبھی دیکھو تو کتنے دلکش و دلرش ہوتے ہیں
شبِ غم آرزوؤں کے سمٹتے پھیلتے سائے

تمنّاؤں کے مدفن پر کوئی اس طرح آیا ہے
سرِ گورِ غریباں جیسے کوئی پھول کِھل جائے

اندھیرے جانے کتنے اپنے پیچھے چھوڑ جائے گا
تری بزمِ چراغاں سے جو یہ دیوانہ اُٹھ جائے

لٹے جن منزلوں پر خیمۂ زرکار پھولوں کے
وہیں سازِ بہاراں پر کئی نغمے بھی تھرّائے

جو زیرِ سایۂ دیوارِ گلشن ہیں، وہ کیا جانیں
زمانے کی کڑی دھوپوں میں کتنے پھول مرجھائے

نگاہوں میں مہ و انجم لیے غم کے اندھیروں میں
فرشتوں کے مقدس روپ میں شیطاں نظر آئے

کلیمؔ اب تو کرم کے نام سے بھی دل لرزتا ہے
عزیزوں نے کرم کے نام پر ایسے ستم ڈھائے

●

دِن ڈھل گیا تو چھائے جب شام کے دُھندلکے
آنکھوں کی جھیل میں وہ پانی پہ آئے چل کے

ٹپکے گا چشم ترسے جب تک نہ دِل پگھل کے
یہ آگ عشق کی ہے: بجھتی کہاں ہے جل کے

مجھ کو شعور آیا اس دن سے بے خودی کا
نظروں کے جام تیرے پہلے پہل جو چھلکے

ایسا ہے کچھ سمندر چیخوں کا میرے اندر
میں نغمے پیار کے کیا باہر سنوں نکل کے

گُل ہم نے ہیں کھلائے کانٹوں کو خون دے کر
حق اب جتانے آئے یہ نونہال کل کے

مارے ہیں لاکھ پتھر لوگوں نے ٹہنیوں پر
ہر رُت میں پیڑ پھر بھی رہتے ہیں پھول پھل کے

دیکھا کچھ ایسا اُس نے محفل میں میری جانب
آنکھوں کے جل پہ جیسے بہتے ہوں گُل کنول کے

گلشن کو فکر و فن سے سینچا نہ خوں سے جب تک
یہ رنگ روپ اتنے چمکے تھے کب غزل کے

نکلی وہیں سے دِل کی منزل کلیمؔ آخر
چھوڑا ہے ہاتھ میرا اُس نے جہاں سنبھل کے

●

نفرت تھی جنہیں پینے سے کبھی ہاتھوں میں ہیں اُن کے پیمانے
اے گردشِ دوراں تیرا کرم اب جاگ اٹھے ہیں میخانے

ہم ایسے اسیرِ جورِ خزاں محرومِ بہاراں بھی تو نہیں
خوابوں سے سجائے جاتے ہیں ہر روز چمن کے ویرانے

تخریب کے ہر اک پہلو کو تعمیر کا پہلو کہتے ہیں
آثارِ خزاں کو سمجھے ہیں آثارِ بہاراں دیوانے

خاموش سمندر کی تہہ سے طوفان اچانک اٹھتے ہیں
پروردۂ ساحل ہے جو ابھی موجوں کی سیاست کیا جانے

کعبہ ہی نہیں کچھ حدِ نظر ہیں حسن کے جلوے شام و سحر
وہ شمعیں جلی ہیں آنکھوں میں روشن ہوئے جن سے بتخانے

کچھ ہم نے اجالا دیکھا ہے کچھ ہم نے اندھیرا دیکھا ہے
اے ذوقِ تماشہ کچھ تو بتا معیارِ نظر کس کو مانے

اے دوست جہانِ الفت میں راتوں کا مقدر ہوتے ہیں
یادوں سے چمکتے غم خانے اشکوں سے منور کاشانے

جب خونِ جگر ملتا ہے کلیم آتا ہے نکھار ان غزلوں میں
کیا چیز ہے مشقِ شعر و سخن اک طفلِ دبستاں کیا جانے

•

قطعہ

جبر میں اختیار کا رجحان
ہوش میں ہے خمار کا رجحان
زندگی سے قریب کرتا ہے
زندگی سے فرار کا رجحان

بے خود ہیں تیرے جلوۂ توبہ شکن سے ہم
ہیں بے نیازِ بادۂ رنج و محن سے ہم

وہ بھی جنونِ عشق میں معدوم ہو گئے
جو نقش لے چلے تھے تیری انجمن سے ہم

گلدستۂ بہار نے دل سے لگا لیا
بادِ خزاں کے ہاتھوں جو نکلے چمن سے ہم

ملتے تھے پہلے شوق کو صحرا نئے نئے
اب تو جنوں میں کھیلتے ہیں پیرہن سے ہم

ہر بوالہوس کو دعویٔ منصور ہو گیا
اب جاں بہ لب ہیں نعرۂ دار و رسن سے ہم

قدریں بھی حوصلے بھی مسائل بھی عشق بھی
زلف غزل سجاتے رہیں بانکپن سے ہم

دل کیا گیا کلیمؔ گئیں گلفشانیاں
الجھے ہوئے ہیں دامن خار وطن سے ہم

●

طلوعِ صبح کے خوش فہم انسانوں پہ کیا گزری
حقیقت سامنے آئی تو افسانوں پہ کیا گزری

سحر جاگی تو یہ جلتے ہوئے سب گھر بتا دیں گے
اندھیری رات میں ہم سوختہ جانوں پہ کیا گزری

چلو دیوانے ہم تھے ناشناسِ مصلحت لیکن
حرم اور دَیر کے جھگڑوں میں فرزانوں پہ کیا گزری

چلے جو سوئے صحرا تو وہی جلوے تھے شہروں کے
خدا جانے جنوں میں آج دیوانوں پہ کیا گزری

یہ اہلِ صبحِ نو کیا قصۂ سوز و فا جانیں!
زبانِ شمع سے سُن رات پروانوں پہ کیا گزری

مرے خونِ وفا سے بام و در تھے جن کے کل روشن
نہ جانے بعد میرے اب ان ایوانوں پہ کیا گزری

اٹھے ہم دیکھ کر بربادیٔ میخانہ جو ساقی
تو تیری مئے فشاں آنکھوں کے پیمانوں پہ کیا گزری

تیری حسنِ عدالت سے تو مجرم چھٹ گئے لیکن
گنہگارانِ ناکردہ پہ نادانوں پہ کیا گزری

کلیمؔ ان آندھیوں سے جو رہے محفوظ کیا جانیں
کئی ارماں بھرے دل کے نہاں خانوں پہ کیا گزری

●

اب اُسے خزاں کہہ کر رو رہے ہیں دیوانے
جو چلے تھے گلشن میں فصلِ گل اڑا لانے

اصلِ دعوئ تعمیر کوئی کس طرح مانے
آج کتنے شہروں پر بس رہے ہیں ویرانے

منزلِ غمِ ہستی ہے کہاں خدا جانے
دُور تک اندھیرا ہے راستے ہیں انجانے

اِس طرح نہ پھر آئے فصلِ رنگ و بو یارب
آج ہم کو اپنے بھی کہہ رہے ہیں بیگانے

اُن کی چشمِ میگوں ہے کتنی مے فشاں پھر بھی
زندگی سے خالی ہیں زندگی کے پیمانے

وقت کے اندھیروں کو اک پناہ دیتے ہیں
شہرِ بے چراغاں میں روشنی کے کاشانے

شام سے سُلگنے دو دِل کے سب چراغوں کو
رہ گئے ہیں لے دے کے یہ سحر کے نذرانے

ٹھیک ہی کیا تم نے، شمعِ انجمن بن کے
حسبِ ذوقِ خودسوزی جل مرے گئے پروانے

لفظ لفظ کے منہ سے خون ہی ٹپکتا ہے
ہم لہو سے لکھتے ہیں عہدِ نو کے افسانے

اِس اَنا کی محفل میں زخمِ زندگی لے کر
آپ کیوں کلیمؔ آئے یہ چراغ سُلگانے



بہار میں بھی جو اندیشۂ خزاں میں رہے
وہ بد نصیب بھلا کیسے گلستاں میں رہے

نفس نفس میں رہے نغمۂ فغاں میں رہے
ہمیشہ آپ میری چشمِ خونفشاں میں رہے

ہم ایک عہد ہیں تاریخ ہم بناتے ہیں
ہمارے تذکرے ہر ایک داستاں میں رہے

ہجومِ خوابِ بہاراں بھی ساتھ تھا ورنہ
اکیلے کون بھلا موسمِ خزاں میں رہے

چھلک رہے ہیں تبسم کے آئینے پھر بھی
یہ اور بات کہ ہم گردشِ جہاں میں رہے

فساد، آگ، دھواں، قتل، خون، ہنگامے
یہ حادثات ہمیشہ میرے مکاں میں رہے

ہے دلفریب یہ روداد گلستاں کتنی
کہ زاغ زادے عقابوں کے آشیاں میں رہے

عجیب چہرے ہیں جن کے خطوط مبہم ہیں
چھپے چھپے جو میری ظلمت گماں میں رہے

وہ دَور آیا ہے حالات کا مزہ چکھیے
کلیم آپ بہت وقت کی اماں میں رہے



حاجتِ دُعا اتنی پُر اثر نہیں ہوتی
سوز و درد سے جب تک آنکھ تر نہیں ہوتی

تم نہ کیوں کُھلے رکھے آندھیوں میں گھر اپنے
آج زندگی ورنہ در بہ در نہیں ہوتی

موجِ یورشِ طوفاں دل شکن سہی پھر بھی
قدرِ ہمتِ مرداں کم مگر نہیں ہوتی

آشیاں کی بنیادیں ہوں اگر محبت پر
کوئی برق آوارہ پُر خطر نہیں ہوتی

آندھیوں میں جھڑتی ہیں کتنی اَدھ کھلی کلیاں
شاخِ آرزو پھر بھی بے ثمر نہیں ہوتی

تم بنو مسیحا اب ہم مگر سمجھتے ہیں
ہر نگاہِ چارہ گر چارہ گر نہیں ہوتی

رنگِ نور و ظلمت ہی عالمِ تغیر ہے
کوئی شب بہر صورت بے سحر نہیں ہوتی

دوست اب تو مجبوراً ہم چمن سے جاتے ہیں
کیا کریں گے کانٹوں میں جب گزر نہیں ہوتی

دفعتاً بھڑکتی ہے آتشِ غضب اکثر
آہِ سوزِ مظلوماں بے اثر نہیں ہوتی

آپ اے کلیمؔ اتنے معتبر نہ کہلاتے
چشمِ دید اگر روشن طور پر نہیں ہوتی

●

داغِ غمِ حیات فروزاں ہے اِن دِنوں
رُوحِ بہار رخارِ بداماں ہے اِن دِنوں

آزاد ہو کے جشنِ بہاراں منائیں کیا
یہ دِل تو وقفِ زحمتِ زنداں ہے اِن دِنوں

کیا ہو گا غنچہ ہائے تمنّا کا دیکھیے
گلچیں کی دسترس میں گلستاں ہے اِن دِنوں

دُنیائے مہر و لطف و وفا خواب ہو گئی
اِنساں ستم رسیدۂ اِنساں ہے اِن دِنوں

چڑھنے لگا ہے دِل پہ بھی تاریکیوں کا رنگ
مدّھم سی اپنی شمعِ شبستاں ہے اِن دِنوں

لفظِ سکون صرف کتابوں میں رہ گیا
ہر دم خیالِ گردشِ دوراں ہے اِن دنوں

دِل کا قرار، چین نہ جینے کی آرزو !
کشتی ہی نذرِ شورشِ طوفاں ہے اِن دِنوں

کیا آبروئے فکرِ سخن بھی گئی کلیم
اب کیا بتائیں کون غزلخواں ہے اِن دِنوں



وہ اضطرابِ ساعتِ ہجراں نہ پوچھیے
کس طرح گزری شامِ غریباں نہ پوچھیے

لیل و نہارِ گردشِ دَوراں نہ پوچھیے
کیا کیا ہوئے ہیں جلوے نمایاں نہ پوچھیے

سوزِ دَرونِ زخم لیے دل میں رات بھر
کیا کہہ گئی ہے شمع فروزاں نہ پوچھیے

محسوس کر رہا ہوں کمی پھر خلوص کی
کس طرح ہو گا دَرد کا درماں نہ پوچھیے

گو سیلِ رنگ رنگ لیے آئی ہے بہار
کیا گُل کھلائے اب کے گلستاں نہ پوچھیے

یہ دورِ ارتقائے خرد خوب ہے مگر
دیوانگیٔ عالمِ انساں نہ پوچھیے

فکرِ معاش لے اُڑی رنگینیاں کلیمؔ
ورنہ وہ بزمِ صحبتِ یاراں نہ پوچھیے

●

جس کا وجود خار ہو حسنِ نگاہِ یار میں
پھر کیا اُسے جگہ ملے گل کدۂ بہار میں

کیا کیا فریب کھائے ہیں لذتِ اعتبار میں
ملتی حیات کاش اور آپ کے انتظار میں

وقت نے کروٹیں جو لیں کیسی فضا بدل گئی
جلوۂ خار گل میں ہے جلوۂ گل ہے خار میں

ہائے نہ چھیڑ اے صبا زخمِ بہارِ جانفزا
کتنی کہانیاں ہیں بند دامنِ تار تار میں

اپنی انا میں گم مگر چلتے ہیں ایسے ہم سفر
جیسے وہی ہیں چارہ گر درد کی رہگزار میں

حائلِ دید تو رہیں اُن کی تجلّیاں مگر
عکس ابھر کے آگیا آئینۂ بہار میں

عشق و خرد میں بحث تھی تیرا جنوں مگر کلیمؔ
جامِ حیات پاگیا جلوۂ حُسنِ یار میں

●

قطعہ

کل وہ زیرِ گِلِ چمن ہوگا
آج جو اِک گُلِ شگفتہ ہے
حُسنِ مغرور کیا نہیں واقف
موت سے زندگی کا رشتہ ہے

▲

نہ اب وہ دِل ہے نہ وہ دردِ دِل کے افسانے
غمِ جہاں نے یہ کیا کر دیا خدا جانے

نہ اضطراب، نہ راحت، نہ آرزو نہ گریز
دھواں دھواں ہیں فقط زندگی کے کاشانے

زمیں کی تنگیٔ داماں سے تنگ دِل ہو کر
چلے ہیں سوئے فلک ارتقا کے دیوانے

مسافروں کے لہو سے جلا جلا کے چراغ
یہ کون اٹھا ہے زمانے کو راہ دکھلانے

ہزار جام فریبِ نظر پیے لیکن
مجھے سنبھال لیا میری لغزشِ پا نے

شعور و فکر کے جلتے ہوئے چراغوں میں
حیاتِ نو کے مرتب ہوئے ہیں افسانے

ہمارا دستِ تصرف بہار پر ہوتا
تو آج خار بہ داماں نہ ہوتے ویرانے

بڑھا گئے ہیں اجالوں کی زندگی کتنی
سیاہ رات میں جل جل کے آج پروانے

غمِ زمانہ، غمِ زندگی، غمِ جاناں
یہ ہیں کلیمؔ مرے میکدے کے پیمانے

●

گلزارِ عہدِ شوق کا منظر لیے ہوئے
آجاؤ پھر بہارِ معطر لیے ہوئے

ہیں آج بھی چمن میں خزاں کی اُداسیاں
پھر بھی روش روش ہے گُلِ تر لیے ہوئے

رکھنی ہے شامِ غم میں اُجالوں کی آبرو!
آؤ چراغ دوئے منوّر لیے ہوئے

تسخیرِ مُلکِ عشق کو نکلا ہے حسنِ ناز!
پُرعزم سی نگاہِ سکندر لیے ہوئے

ہے پُرخلوص کس قدر اندازِ ہمنشیں
لیکن ہے آستین میں خنجر لیے ہوئے

بدلی تیری نگاہ تو ہم تشنگانِ شوق
آئے غمِ حیات کے ساغر لیے ہوئے

کھائے ہوئے ہیں داغ اگر آپ وقت کے
ہم بھی وفا کے زخم ہیں دِل پر لیے ہوئے

یوں طے ہوئی ہے راہِ سلوکِ وفا تمام
ہم دِل کا آئینہ تو وہ پتھر لیے ہوئے

ہو آبروے ارض و سما کی کلیمؔ خیر
فتنہ چلا ہے چاند پہ محشر لیے ہوئے



زمیں پہ آگ کے اٹھتے ہوئے بگولوں میں
تمام جلتے ہوئے گھر دکھا رہا ہے قمر



تو ابھی ترکِ وفا کا نہ دے پیغام ذرا
اِس زمانے کو لہو سے ہے ترے کام ذرا

دعویٰ ترکِ روایاتِ کہن ہے پھر بھی
دِل میں باقی ہے ابھی ظلمتِ اوہام ذرا

نگہِ وقت کی افتاد عجب ہے یارو
لذّتِ جام ذرا، تلخیٔ ایام ذرا

مرہمِ زخمِ وفا سے تو نہ لے کام ابھی
اِن چراغوں کو سلگنے دے سرِ شام ذرا

میرے رِستے ہوئے زخموں پہ جو ہیں محوِ نشاط
اُن کے گھر سے بھی گزر گردشِ ایام ذرا

کیا گوارا ہے مجھے قتل خود اپنا لیکن
لوحِ دوراں پہ کوئی لکھ دے تیرا نام ذرا

فتنۂ دیر و حرم سر پھر اٹھا کر نہ چلے
وقت اک ایسی چلا تیغِ خوں آشام ذرا

حسنِ انصاف کہاں ایسی عدالت میں کلیمؔ
بے گناہی ہو جہاں موردِ الزام ذرا



غمِ آشنا ملے نہ کہیں چارہ گر ملے
گم اپنے ہی وجود میں سب دیدہ ور ملے

جز خاکِ شمعِ دل نہیں سوغاتِ شامِ غم
دے یہ پیامِ شوق جو بادِ سحر ملے

اب کے نئی بہار کے چرچے تو تھے بہت
پھولوں کی آرزوؤں میں کانٹے مگر ملے

ہر ہر خوشی پہ غم کے تھے پہرے لگے ہوئے
ہم زندگی سے جب بھی ملے مختصر ملے

طنز اور تپاک تیشۂ دشنام و اتہام
جب بھی ملے وہ شیشۂ دل توڑ کر ملے

اپنے ہی خوں سے ان کا بھی دامن تھا تر بہ تر
جن سے بہت خلوص سے ہم عمر بھر ملے

پہنے ہوئے لباس اجالوں کے رات دِن
جگنو کئی بہ صورتِ شمس و قمر ملے

آؤ چلیں گے آج اندھیروں کے ساتھ ساتھ
شاید کوئی چراغ سرِ رہگذر ملے

مایوسیوں کو میری سہارا ملا کلیمؔ
جب میرے گھر کی طرح کئی جلتے گھر ملے

ستم رسیدۂ بادِ خزاں رہے ہیں لوگ
نہ چھیڑ قطرۂ شبنم کہ دل جلے ہیں لوگ

ہوئے ہزار چراغانِ جشنِ گُل کیا کیا
چمن میں آج بھی لیکن بجھے بجھے ہیں لوگ

بجھا جو ایک چراغِ غمِ حیات اگر
چراغ دوسرا دل میں جلا گئے ہیں لوگ

چھپائے لاکھ مری زندگی کے افسانے
میرے ہی نقشِ قدم پر مگر چلے ہیں لوگ

الٰہی مجھ کو ذرا طاقتِ بیاں دے دے
کہ وقتِ نزع پھر آواز دے رہے ہیں لوگ

چھپا کے مجھ کو کلیمؔ آج نرم مٹی میں
اُداس اُداس مری قبر سے گئے ہیں لوگ

خار و گُل شیر و شکر بن کے رہا کرتے تھے
ہائے کیا دن وہ بہاروں کے ہوا کرتے تھے

جامِ حق، جامِ شہادت جو پیا کرتے تھے
وہ سمندر بھی تھے پیاسے بھی رہا کرتے تھے

میں نے کچھ زخم ابھارے تھے غزل میں اپنی
جانے کیوں لوگ ترا نام لیا کرتے تھے

تیرے رخسار کی شمعیں، تری آنکھوں کے کنول
روشنی کتنی شبِ غم کو دیا کرتے تھے

کوئی نغمہ نہ فغاں، فصلِ بہاراں نہ خزاں
ایسے موسم کبھی پہلے نہ ہوا کرتے تھے

کیا خبر تھی کہ ہمیں خارِ نظر تھے اُن کے
پھول بن کر جو دل و جاں میں بسا کرتے تھے

ذکرِ تہذیب و روایات چھڑا تو اکثر
فتنۂ دیر و حرم حشر بپا کرتے تھے

کج کلاہی تھی ادا اپنی مگر تیری طرح
کوئی وعدہ کبھی جھوٹا نہ کیا کرتے تھے

گُل ہوئے وہ بھی اندھیروں میں امیدوں کے کلیم
کچھ چراغ اب جو سرِ شام جلا کرتے تھے

ہر بزم رنگ و نور میں آراستہ ملے
اہلِ ہوس جہاں بھی ملے خود نما ملے

یوں دھڑکنوں میں بجتی ہے یادوں کی بانسری
جیسے نوائے دِل کو کوئی ہمنوا ملے

بدلی تری نگاہ تو یارانِ میکدہ
خوشیوں کی طرح رُوٹھ کے ہم سے خفا ملے

ایسی منافقت سے کھُلی دشمنی بھلی
جب دِل میں مَیل ہو تو کوئی تم سے کیا ملے

اُٹھے تھے اک امید پہ کتنے غلط قدم
شاید کہ زندگی کو کوئی راستہ ملے

کچھ راہِ شوق میں ملے جلوے بھی اس طرح
جیسے ہر ایک موڑ پر اک رہنما ملے

اپنا بھی یہ مزاج ہے بزبانِ بقولِ داغ
"کوئی کھنچے کھنچے کوئی ہم سے بلا ملے"

ہر چشمِ نم میں اپنا ہی غم دیکھتے گئے
سب وقت کا کلیم لیے آئینہ ملے



ہم اہلِ تبسم ہیں اپنی ہر غم میں گزر ہو جاتی ہے
شبنم سے گلوں کی سوکھی ہوئی ہر شکل بھی تر ہو جاتی ہے

رُودادِ بہاراں کیا کہیے یوں بیت رہی ہے عمرِ رواں
خوابوں کا گلستاں جلتا ہے شعلوں میں بسر ہو جاتی ہے

بے باک شناورِ ہمت کے اسرارِ سمندر کیا جانیں
اک موجِ خراماں بھی اکثر لالچ میں بھنور ہو جاتی ہے

جب اپنی انا میں اِترا کر ہر راہ بدلتے ہیں رہبر
خود دار نگاہِ عزمِ جواں خود خضرِ سفر ہو جاتی ہے

ہو قہر و غضب یا لطف و کرم ہم آنکھوں سے پینے والوں کی
کچھ اور طلب بڑھ جاتی ہے سرشار اگر ہو جاتی ہے

ہم بادہ کشانِ شوق پیکاں مرکوز نہیں اب اُن کی نظر
صہبائے غمِ ایام بھی کیوں محرومِ اثر ہو جاتی ہے

شبنم سے بُجھانے پلکوں کے شعلوں کو نسیم آتی ہے سحر
جب دیکھ کے اُن کو خوابوں میں بے خواب نظر ہو جاتی ہے

ذلتیں اوصافِ بُرِ توقیریں دیکھیں گے سب
عظمتِ انسانیت تعزیریں دیکھیں گے سب

جب اُجالے ظلمتِ شب گیر میں دیکھیں گے
عکسِ تخریب اُس گھڑی تعمیر میں دیکھیں گے سب

یہ حسیں سپنے، حسیں وعدے، حسیں خوش فہمیاں
رہبرانِ قوم کی تقریریں دیکھیں گے سب

خودستائی، خودنمائی، خودپرستی، خودسری
اب یہ تصویریں ہر اک تصویر میں دیکھیں گے سب

ڈھونڈتے ہیں جن حسیں خوابوں کی جھیلوں میں کنول
خون کے دلدل وہی تعبیر میں دیکھیں گے سب

وقت ہے اب بھی سنبھل ظالم کہ ہر نمرود کو
وقت کی جکڑی ہوئی زنجیر میں دیکھیں گے سب

اک صدائے کرب پر کھل جائے گا بابِ قبول
یہ دعا مظلوم کی تاثیر میں دیکھیں گے سب

کون کہتا ہے نہیں ہم پر وہ چشمِ التفات
ہاں مگر اس کا کرم تاخیر میں دیکھیں گے سب

شکوۂ ظلماتِ محرومی ہے توہینِ حیات
روشنی تقدیر کی تدبیر میں دیکھیں گے سب

داغِ دل تو ہے فقط محدود سینے تک مگر
وسعتِ روئے قمر تنویر میں دیکھیں گے سب

یہ کم آمیزی، یہ افسانہ نگاری اے **کلیم**
آپ میں اور آپ کی تحریر میں دیکھیں گے سب



کوئی تو ہو شعلہ افشاں دل کے گل خانوں کے پاس
رکھ لیا ہے میں نے اُن کا غم بھی ارمانوں کے پاس

وہ بھی نذرِ جلوۂ شہرِ نگاراں ہو گیا
جو بچا تھا اک دلِ دیوانہ دیوانوں کے پاس

اِن ہوس کے پُرکشش جلوؤں سے گر ہٹتی نظر
تھے رموزِ عشق کے گل بھی گلستانوں کے پاس

جلوہ گاہِ شامِ غم ہیں ہم غریبوں کے مکاں
شمعِ جمہوری مگر روشن ہے ایوانوں کے پاس

سازِ امن و نغمۂ ساحل نہیں اپنی طلب
کشتیِ عمرِ رواں رہتی ہے طوفانوں کے پاس

زلزلہ، بجلی، دھماکہ، آگ، طغیانی، دھواں
کتنے ہنگامے بپا ہیں آج دیوانوں کے پاس

اب مزاجِ عشق کی نیرنگیاں بھی دیکھ لو
شمع خود کھنچ کر چلی آئی ہے پروانوں کے پاس

کیوں نہ ہو جذباتِ دل کا آئینہ فکرِ سخن
ہم بھی بیٹھے ہیں کلیمؔ اکثر سخن دانوں کے پاس

خیالِ ترکِ رفاقت ہے کیا کیا جائے
ہوس بہ نامِ محبت ہے کیا کیا جائے

ہوائے آتشِ نفرت ہے کیا کیا جائے
ہر ایک سمت یہ آفت ہے کیا کیا جائے

سنا ہے دھوم سے نکلے گا قاتلوں کا جلوس
تمام شہر میں دہشت ہے کیا کیا جائے

لبوں پہ یکجہتی کا پیام ہے لیکن
دلوں میں بغض و کدورت ہے کیا کیا جائے

حدودِ دیر و حرم سے نکل کے آیا ہوں
حیات وقفِ ہلاکت ہے کیا کیا جائے

فریب، جھوٹ، تصنّع، ہوس، ریاکاری
رَوِشِ زَدِشِ یہی صورت ہے کیا کیا جائے

وہ مل رہے ہیں گلے ایک اجنبی کی طرح
مجھے بھی پاسِ روایت ہے کیا کیا جائے

مصیبتوں کا بہت زہر پی لیا میں نے
رگوں میں خونِ شرافت ہے کیا کیا جائے

کلیمؔ دُور رہا مصلحت پسندی سے
مگر یہ دَورِ سیاست ہے کیا کیا جائے



غم میں شعورِ غم کی قیادت ملی مجھے
تاریکیوں میں ملتی رہی روشنی مجھے

کی شہرِ بے چراغ میں جب میں نے روشنی
ڈسنے کو آئی گھر میرے خود تیرگی مجھے

نفرت کبھی، خلوص کبھی، مصلحت کبھی
ہر گام رُخ بدل کے ملی زندگی مجھے

جسموں کی آگ، چشمِ ہوس اور لبوں کی مے
بازارِ وقت میں بہت ارزاں ملی مجھے

خوابوں کے اِس دیار میں کچھ ڈھلتے ماہتاب
خوش فہمیوں کی دیتے رہے چاندنی مجھے

شامل ہیں بیخودی میں بھی کچھ ہوش مندیاں
ہر لغزشِ قدم سے رہی آگہی مجھے

کھاتا رہوں فریب یہ کب تک میں اے کلیمؔ
ملتی ہے غم کے روپ میں ہر اک خوشی مجھے



دیوانے دورِ چشمِ تغافل سے تھک گئے
لو پھر جنونِ شوق کے ساغر کھنک گئے

موسم ہوئے جو پھر ترے وعدوں سے خوشگوار
خوش فہمیٔ حیات کے گلشن مہک گئے

پتھراؤ سے تو بچ گئے حالات کے مگر
صحرائے زندگی کی انا میں بھٹک گئے

کچھ پاسبانِ شیوۂ انسانیت جو تھے
وہ بھی صلیبِ دیر و حرم پر لٹک گئے

ہم بھی تو اہتمامِ بہاراں میں تھے شریک
پھر آج کیوں تمہاری نظر میں کھٹک گئے

بدلا مزاجِ وقت تو کتنے مزاج داں
اپنی انا کے سایۂ دیوار تک گئے

جب بھی چھڑا ہے سازِ شبِ غم پہ کوئی گیت
بزمِ تصورات میں پائل جھنک گئے

ہونے لگا جو اُن کی جفاؤں پہ تبصرہ
تاریکیوں میں پیار کے جگنو چمک گئے

بکھرا جو خوابِ صبح نگاراں تو پھر کلیمؔ
حالات کی فصیلِ شبِ تار تک گئے

جلوہ پابندِ طور ہے اب تک
دل وہی کوہِ نور ہے اب تک

زیست سے کم نہیں خوشی لیکن
غم متاعِ شعور ہے اب تک

فاصلہ بس نشاط و غم کا ہے
وہ قریب ہے نہ دور ہے اب تک

میکشی کا اگر سلیقہ ہو
غم میں کیف و سرور ہے اب تک

دل کی چوکھٹ پہ ہے غموں کی بھیڑ
دل میں کوئی ضرور ہے اب تک

دِن کا سورج تو ڈھل گیا کب کے
ذِکرِ رخسارِ حور ہے اب تک

ہر پسِ رخ ہے اک رخِ روشن
زندگی کا ظہور ہے اب تک

یہ تیرا منکر مزاج حلیم
بندۂ پر غیور ہے اب تک

●

آغوشِ غم میں پیار کو پلنا پڑا میاں
شبنم سمجھ کے آگ میں جلنا پڑا میاں

برگِ خزاں کی طرح ہیں ہم راندۂ چمن
اب رخ ہوا کا دیکھ کے چلنا پڑا میاں

کام آ گئی بہ عزمِ جنوں لغزشِ حیات
لیکن تمام عمر سنبھلنا پڑا میاں

ترکِ تعلقات کی لذّت نہ پوچھیے
نظروں کی گفتگو سے بہلنا پڑا میاں

اُس پھول پر نگاہِ بہاراں بھی ہے خجل
جس کو خزاں میں پھولنا پھلنا پڑا میاں

نفرت سے شعلہ رُو تو نگاہیں رہیں مگر
غازہ بھی رُخ پہ پیار کا مَلنا پڑا میاں

تہذیبِ نو کے دَور میں اہلِ خلوص کو
اپنی رَوِش کے طور بدلنا پڑا میاں

دنیائے دَرد و کرب میں جذباتِ ضبط کو
سانچوں میں شعر و فکر کے ڈھلنا پڑا میاں

اِک روشنیٔ صبح کی خاطر ہمیں کاٹیم
جلتی شمعوں کی طرح پگھلنا پڑا میاں



جب تم رہے اور آئینۂ دِل میرا رہا
پھر عکس کب کسی کا مقابل بھلا رہا

ہر رہگذارِ غم میں بھٹکتی رہی حیات
رفتارِ وقت سے جو میں غافل ذرا رہا

کچھ ایسی دور بھی تو نہ تھی منزلِ یقیں
اِک حادثہ مگر تھا جو حائل سدا رہا

چھنتے تھے جس کی آستیں الفت کے فلسفے
اُس آستیں میں خنجرِ قاتل چھپا رہا

بس اِک نگاہ لطف وہ ہم پر جو پڑ گئی
پھر عمر بھر یہ کاسۂ سائل بھرا رہا

اِن عاقبت پسندوں کو کیا یہ نہیں خبر
طوفاں کی زد سے کونسا ساحل بچا رہا

خونِ رگِ حیات سے نکھرا ہے جو کلیمؔ
رنگِ غزل وہ فکر کا حاصل بنا رہا



اظہارِ جذبۂ دل پوشیدہ دیکھنا
اب پھول خود ہیں خار کے گرویدہ دیکھنا

عہدِ رواں کا جلوۂ شوریدہ دیکھنا
بیدار جو ہے فتنۂ خوابیدہ دیکھنا

تیری بساطِ جبر و تشدد اُلٹ نہ جائے
اب کے تو ہم بھی ہو گئے سنجیدہ دیکھنا

سلطے پہ زندگی کے نہ کر اس قدر گھمنڈ
دیوار اس کی کب سے ہے بوسیدہ دیکھنا

ترکِ تعلقات کا کھل جائے گا بھرم
محفل میں یوں نہ پھر مجھے دُزدیدہ دیکھنا

خود وقت ہی بتائے گا وہ دن خدا کرے
تجھ کو بھی گھر کی آگ میں نم دیدہ دیکھنا

ہوتا ہے جو بھی گم وہ ابھرتا ہے کب یہاں
گلیاں ہیں شہرِ عشق کی پیچیدہ دیکھنا

صہبائے غم سے شیشۂ دل پر نہ کیوں ہے
تصویر اُس پہ ہے کوئی چسپیدہ دیکھنا

آتا ہے انتقام بھی لینا مگر کلیم
دل چاہتا نہیں اُسے رنجیدہ دیکھنا

●

بدلے ہوئے حیات کے تیور ہیں سامنے
طوفان میں چراغ منوّر ہیں سامنے

قتلِ حسینؑ کے وہی منظر ہیں سامنے
پھر سے یزیدِ وقت کے لشکر ہیں سامنے

تہذیب و ارتقا کے اُجالوں کے باوجود
تاریکیوں کے کتنے سمندر ہیں سامنے

دنیائے عشق و حُسنِ وفا خواب ہو گئی
جھکے ہوئے ہوس کے گلِ تر ہیں سامنے

اِس دَور میں شناخت بھی قاتل کی جرم ہے
ورنہ پھر انتقام کے خنجر ہیں سامنے

رنگِ تجلّیاتِ بہاراں نہ پوچھیے
اب خار ہوں کہ پھول برابر ہیں سامنے

اب ذکرِ حسنِ لالہ رُخاں بن گیا ہے خواب
کچھ ذہنِ عشق پھر بھی مُعطّر ہیں سامنے

ہے وقت کی عطا یہ سرورِ غزل کلیمؔ
ہر دم چھلکتے فکر کے ساغر ہیں سامنے



حدیثِ موسمِ گُل کیا تمہیں سنانا ہے
دھواں دھواں سا میرے دِل کا آشیانہ ہے

ہوائے ذوقِ طلب ہے جہاں میں شہرت کی
یہ شاعری تو میرے دوست اک بہانہ ہے

خزاں کے بعد خزاں کا ہے سلسلہ اب تک
دِلوں میں خوابِ بہاراں مگر سہانا ہے

نہیں ہے خود کوئی مخصوص مسلکِ ناصح
یہ اور بات کہ ہر بات ناصحانہ ہے

رہے ہیں کب سے اسیرانِ شامِ غم پھر بھی
وہی آجلائے وہی اپنا مسکرانا ہے

اُتارے جاتے ہیں پیچھے سے پشت میں خنجر
سلوک اُن کا بظاہر تو مخلصانہ ہے

چلے ہیں ساتھ چراغِ وفا جلائے ہوئے
یہ روشنی ہمیں ہر دَور کو دکھانا ہے

جدید طرز و قدامت کا آئینہ ہے مگر
دِلوں پہ تیرا ہر اک شعر تازیانہ ہے

سخنوروں کے لیے ہے سخنوری ورنہ
کلیمؔ بانسری بہروں میں کیا سنانا ہے

●

غم کے تاتوں پہ کھلی زلفِ شکن رات گئے
بڑھ گئی اور بھی زخموں کی جلن رات گئے

جگمگاتا ہے خیالوں کا گگن رات گئے
کھل گیا سارے زمانے کا چلن رات گئے

نغمۂ صبحِ طرب لوگ سمجھتے تھے مگر
کوئی روتا رہا مظلوم وطن رات گئے

جشنِ گل میں بھی صبا کچھ تو بتا میرے بعد
یاد کیا مجھ کو کیے اہلِ چمن رات گئے

زندگی چلتی ہے یوں آج بھی جیسے کوئی
کشتۂ زلف کا جلتا ہے بدن رات گئے

درد، غم، کرب، کسک، ٹیس، جلن اور کھٹک
ہے مسلسل وہی کانٹوں کی چبھن رات گئے

یوں تو گھیرے ہیں بہت غم کے اندھیرے پھر بھی
مسکراتی ہے ترے رُخ کی کرن رات گئے

زخمِ احساس سے رستا ہی رہا دِل کا لہو
شمع کی لَو پہ جلی فکرِ سخن رات گئے

جب کوئی نقشِ قدم دل میں ابھرتا ہے کلیمؔ
یاد آتا ہے صنم زادِ دکن رات گئے

کانٹا خزاں کا ہے میرے دل میں چبھا ہوا
اب فصلِ گُل نے پھول کھلائے تو کیا ہوا

اب کے لگا بہار کا یوں رنگ اُڑا ہوا
جیسے فساد میں ہو کوئی گھر لُٹا ہوا

ہے خیر و شر سے یہ جہاں زنداں بنا ہوا
کب اس قفس سے کوئی پرندہ رہا ہوا

نادان ہے وہ اصل کی پہچان آسے کہاں
تتلی کا دِل ہے جس پہ بھی مائل ہوا ہوا

دیدار کے یہ رنگ، یہ جلوے حجاب کے
میں خواب میں ہوں خواب کوئی دیکھتا ہوا

وہ جس نے ساری رات اندھیروں میں کی بسر
دن میں وہی اُجالے بِلا بانٹتا ہوا

چہرہ حقیقتوں کا نظر آئے کس طرح
ہر رُخ پہ مصلحت کا ہے غازہ مَلا ہوا

اِک لمحہ بس خوشی کا تھا یوں غم کی دھوپ میں
اِک پَل کو جیسے بھاگتا سایہ تھما ہوا

یوں شامِ غم ہے حال دلِ بدنصیب کا
مجرم ہو جیسے کوئی سزا کاٹتا ہوا

تھا جس حِنائی ہاتھ پہ میرا کلیمؔ نام
میرے لہو میں ہاتھ ہے اب وہ رنگا ہوا

●

نبضِ شامِ غم جیسے پھر رُکی رُکی سی ہے
صبح آس کے عارض پر پھر جھکی جھکی سی ہے

پھر نسیم یادِ دل کی دل کو چھو گئی شاید
شبنم آس کی پلکوں پر پھر جمی جمی سی ہے

گو بڑی محبت سے ملنے آئے وہ پھر بھی
جیسے خیر مقدم میں کچھ کمی کمی سی ہے

کان رکھ کے سنتے ہیں در پہ تیرے دیوانے
ذہن و دل میں سرگوشی کیا دبی دبی سی ہے

ہم چلے تھے دنیا کے درد بانٹنے لیکن
گردشِ جہاں جانے کیوں تھکی تھکی سی ہے

ایک سب کی ہے مٹی، ایک اصل ہے سب کی
خاکِ دَیر و کعبہ پھر کیوں بٹی بٹی سی ہے

لفظ لفظ پھولوں کے ہار ہیں غزل اپنی
اک عروسِ نو جیسے کچھ سجی سجی سی ہے

کیا کرے کلیمؔ ایسی صبحِ نو کوئی پا کر
جوت جوت سپنوں کی جب بجھی بجھی سی ہے



ذکرِ تدارکِ غمِ ایام کیا کریں !
بکھرے پڑے ہیں شوق کے سب جام کیا کریں

ظلمت کی دسترس میں اجالوں کی ہے حیات
جلنے لگے چراغ سرِ شام کیا کریں

آغازِ لطفِ جور کے جاری ہیں سلسلے
بے وقت فکرِ تلخیٔ انجام کیا کریں

قاتل لٹیرے ظلم کی آغوش کے پلے
ہم پر لگا رہے ہیں یہ الزام کیا کریں

ہر آن خوفِ زیست ہے ہر آن بے کلی
اب اہتمامِ کیفِ دلآرام کیا کریں !

تاریخ کی رگوں میں تو اپنا ہی خون ہے
اب سوچتے ہیں دوسرا اقدام کیا کریں

نقال فکرِ خام ہوئے صاحب کلام
شعرائے پختہ کام ہیں گمنام کیا کریں

آؤ رخِ حیات کو دیں بانکپن نیا
جو بات عام ہے اسے بہتر عام کیا کریں

بکھری ہوئی حیات کے اس دور میں کلیم
دیدارِ جلوہ گاہِ در و بام کیا کریں

پہلے تم آئینۂ حالاتِ محفل دیکھتے
پھر مجھے جکڑے ہوئے طوق و سلاسل دیکھتے

بھائی کی تلوار کے نیچے تھا بھائی کا گلا
کاش تم مقتل میں ہوتے رقصِ بسمل دیکھتے

رِس رہا تھا حال کے زخموں سے ماضی کا لہو
قہر برسانے سے پہلے دستِ سائل دیکھتے

آستیں میں تھا چھپا خنجر تمہیں ہم واقف مگر
مخلصانہ کتنا تھا اندازِ قاتل دیکھتے

کٹ گئی تسخیرِ مہر و ماہ و انجم میں حیات
آرزوئے دل تھی تم کو فاتحِ دل دیکھتے

یہ کرم آمیز نظریں کس پہ ڈالی جائیں گی
تم مسیحا تھے تو پہلے نبضِ محفل دیکھتے

رقصِ انجم، نکہتِ گل، موجِ مے، سازِ شباب
تھی حقیقت غرقِ ساغر کیسے باطل دیکھتے

مصلحت کی ظلمتوں میں گھر گئے تھے ورنہ تم
ہر قدم پر زندگی کی شمعِ منزل دیکھتے

سازِ شوق و نغمۂ طوفان تھی اپنی طلب
ہم بھلا کیا اتصالِ موج و ساحل دیکھتے

زلف کے خم، زیست کی الجھن، تقاضے وقت کے
ان مسائل کا سلجھنا تھا جو مشکل دیکھتے

تھا وہ خود یوں رونما تو کس طرح آخر کلیم
برق سے نظریں ملا کر روئے کامل دیکھتے

●

قطعہ



پھر اب کی بہار دن میں شاید وہ اِدھر آئیں
اے باغباں دروازہ گلشن کا کھُلا رکھنا
جو پیڑ پہ پت جھڑ کے ہاتھوں سے لکھا میں نے
ساون کی پھوارو تم وہ نام ہرا رکھنا



فکرِ رواں

موج در موج

نظمیں گیتیں

فصلِ گُل ہے عام لیکن اپنی اپنی بو
شعلۂ دامن ملا سب کو گُلِ شبنم مجھے

کلیمؔ

روٹھے ہوئے موسم سے

⁂

کیوں تصوّر میں مسکراتا ہے
رونے والے کو کیوں رُلاتا ہے
خوب موقع سے ملنے آتا ہے
مجھ کو کھویا ہوا جو پاتا ہے
یاد آ آکے گوشۂ دل میں
اُجڑی بستی کو کیوں بساتا ہے
آتشِ غم بھڑک اُٹھی ہر سُو
کس لیے اتنا یاد آتا ہے
بُجھ گئی شمع لالہ و گُل کی
اب کسے روشنی دکھاتا ہے
دِن کی اُجلی قبا اُتار آیا
لُطفِ ظلماتِ شب اُٹھاتا ہے

دیکھ کر باغ میں بہار کا روپ
میری آنکھوں میں تو سماتا ہے
گُل سے خوشبو صبا نے لوٹی ہے
تو جو گلشن سے منہ چھپاتا ہے
کیا جلا ہوگا طور کا فانوس
میرے دِل کو جو تو جلاتا ہے
اوٹ سے اپنے عہدِ رنگیں کی
آئینے کتنے تو بتاتا ہے

(۲)

یاد آتے ہیں وہ چمن والے
وہ گُل اندام، گُل بدن والے
صحنِ گلشن کے وہ حسین تنکے
عکس تھے آفتاب میں جنکے
جن سے تھی بزمِ کہکشاں روشن
اور ہر شاخِ گُلستاں روشن
ہر روِش اِک تجلّیٔ گلنار
ہر سو ایستادہ خیمۂ زرکار
روئے گیتی تھا ششدر و حیراں
آبشارِ فلک سراسیماں

رشک سے آپ اپنے جلتا تھا
لبِ ساغر بھی آہ کرتا تھا
ہائے وہ دِن ہیں اب نہ وہ راتیں
عشرتِ زندگی نہ وہ باتیں
آج تک آنسوؤں میں ڈھلتا ہے
صورتِ شمع دِل پگھلتا ہے
لالہ زاروں میں تجھ کو ڈھونڈا ہے
چاند تاروں میں تجھ کو ڈھونڈا ہے
زندگی میرا خواب ہونے لگی
اک مسلسل عذاب ہونے لگی

اے وہ روٹھے ہوئے زمانے سے
پھر چلے آ کِسی بہانے سے

●

پردیس کی ایک شام

ستارہ شام کا چمکا شفق کے سرخ داماں میں
گیا ہے مہر عالم تاب مغرب کے شبستاں میں
ہے ظلمت کا سماں یا زلف بکھری ہے بیاباں میں
مہک اٹھی ہے ہر سو بوئے گل صحن گلستاں میں

پریشاں زلف شب ہونے لگی فطرت کے شانوں پر
پرندے ہیں نوا سنج مسرت آشیانوں پر

ضیا مہتاب کی پڑنے لگی رعنائیاں لے کر
ادائے خاص سے سبزہ اٹھا انگڑائیاں لے کر
فضا جلوہ نما ہے حسن کی پرچھائیاں لے کر
خیال آیا کسی کا انجمن آرائیاں لے کر

یہ نظارہ حقیقت میں سکوں کا نام ہے گویا
یہی شام بہاراں خلد کا پیغام ہے گویا

یہ منظر واقعی کیا عشق کے طوفاں کا دھارا ہے
جَلا دے خرمنِ دِل کیا یہی ایسا شرارا ہے
دِلوں کی دھڑکنوں کا کیا یہی واحد سہارا ہے
نظر بسمل ہو جس سے کیا یہی قاتل نظارا ہے

مگر دِل پھر بھی ایسے وقت کب بے آس ہوتا ہے
جو مجھ سے دُور رہتا ہے وہ میرے پاس ہوتا ہے

میری نظروں سے رہ کر دُور مجھ کو پا گیا کوئی
خیال و خواب کی دنیا پہ آ کر چھا گیا کوئی
نقابِ رُخ اُلٹ کر مجھ کو پھر تڑپا گیا کوئی
ادائے برق بن کر دِل میں پھر لہرا گیا کوئی

جگر میں، قلب میں غم کی کئی چنگاریاں بھر دیں
کسی نے جسم میں لا کر مقیّد بجلیاں کر دیں

مسافر کے لیے گلزار کب گلزار ہوتا ہے
وطن کی یاد میں ہر تار بستر خار ہوتا ہے
اُسی سے پوچھیئے غربت میں جو بیمار ہوتا ہے
مسیحا اس کو کیا جانے جو حالِ زار ہوتا ہے

سراپا دَرد بن کر دل پہ اب چھانے لگا کوئی
مجھے پردیس میں رہ رہ کے یاد آنے لگا کوئی

نذرِ عالمگیرؒ

اے کہ عالمگیرؒ شاہِ کشورِ ہندوستاں
اے کہ نورِ چشمِ بابرؒ دولت شاہ جہاں
اے کہ تصویرِ حیات و اکبر اعظم کی جاں
اے کہ ہے وابستہ تجھ سے ایک دورِ ضوفشاں

ہائے آغوشِ دکن میں آج تو ہے محوِ خواب
عہدِ شاہی جس کا ہے تاریخ کا زریں باب

آفریں! وہ رعب و ہیبت تیری عظمت آفریں
آفریں! وہ عدل و انصاف و عدالت آفریں
آفریں! وہ دوررس تیری فراست آفریں
آفریں! وہ تیرا اندازِ سیاست آفریں

یوں اگر اب دیکھئے تو چاند بھی ہے عیب دار
ورنہ تیری ذات ہے اِک دور کی آئینہ دار

عِلم پرور تیری ہستی، تو سراپا علم و فن
تو شہنشاہِ عمل، تیری جبیں غیراز شکن
صاحبِ جود و سخا، تو صاحبِ شعر و سخن
کم تھا جتنا ناز کرتے تجھ پہ اربابِ وطن

سادگی کا اِک مکمل حُسنِ تخت و تاج تھا
تیرے اخلاق و مُروّت کا دِلوں پر راج تھا

زندگی تیری مسلسل تھی اسیرِ کار زار
انتظامِ سلطنت میں تھا سدا تو بیقرار
تھا شجاعت کا دھنی تو بیکسوں کا غمگسار
تیری ہستی اتحاد و امن کی تھی یادگار

سلطنت میں تیری اعلیٰ جتنے عہدیدار تھے
باہنر ہر قوم کے، وابستۂ سرکار تھے

مغلیہ شاہوں میں تھا تو تاجدارِ بے مثال
تھا ستارہ مُلک کا جب کس قدر روشن جمال
موت کی ضربت سے لیکن جب ہوا تیرا وصال
ہند کی تقدیر کو بس آگیا جیسے زوال!

کوئی بیڑا زیست کا تادیر چل سکتا نہیں
موت کے گرداب سے بچ کے نکل سکتا نہیں

زندگی میں تھا جو تنہا مالکِ ہندوستاں
خاک کا ننھّا سا تودہ رہ گیا تیرا نشاں
تو نہیں ہے نام تیرا ہے سدا روشن یہاں
تیری رفعت کی ابھی تاریخ شاہد ہے جہاں
سچ تو یہ ہے لوگ اچھوں کو بُرا کہتے نہیں
ہاں مگر جن کو تعصب ہے بھلا کہتے نہیں

●

قطعہ

جب حسیں خواب کے جھروکے میں
وہ مجھے دیکھ کر اُٹھے ہوں گے
سرِ مژگاں چراغ سلگا کر
رات بھر میرے خط پڑھے ہوں گے

▲

جشنِ آزادی

رُوئے غمِ حیات پہ چھانے لگی خوشی
صدیوں کی آج پاؤں سے بیڑی نکل گئی
ظلماتِ شامِ اہلِ وطن آخرش چھٹی
آزادیوں کی صبح نمودار ہو چکی

یہ برص زادے اب سُوئے مغرب ہی جائیں گے
مشرق کی خواب گاہ سے بستر اٹھائیں گے

خوش ہیں کہ گردشوں کا زمانہ بدل گیا
اب سرزمینِ ہند سے طوفان ٹل گیا
سرمایہ داریت کا جنازہ نکل گیا
ہر لڑکھڑاتا پائے غریباں سنبھل گیا

رُخ سے نقابِ پست و بلندی اٹھائیں گے
جمہوریت کے آئینے میں مسکرائیں گے

اب پھر نئی حیات کا جاگا ہے انقلاب
اُٹھتا ہو جیسے کوہ کے پہلو سے آفتاب
انگڑائی لیتا جیسے اُٹھے نغمۂ رباب
جیسے کسی حسین کا اُٹھتا ہوا شباب

نفرت کے جبر و جور کے زندان ڈھائیں گے
دل کے خزانے پیار میں لُٹوائے جائیں گے

اِک جانفزا بہارِ گُل اندام کی طرح
دلدار و دِل فروز و دِل آرام کی طرح
مہتاب و آفتاب بدر و بام کی طرح
میخانۂ نگاہ کے ہر جام کی طرح

یوں ہم بہارِ خُلدِ بریں لے کے آئیں گے
یکجہتیٔ حیات کا ہر گُل کھلائیں گے

اب دُور اپنی زیست سے بادِ سموم ہے
ہر سُو وطن میں جشنِ بہاراں کی دھوم ہے
خود آگہی کے جلوؤں کا دیکھو ہجوم ہے
رنگینیوں کی بزم ہے رقصِ نجوم ہے

بادِ صبا کے دوش پہ پرچم اُڑائیں گے
آزادیوں کی چھاؤں میں نغمات گائیں گے

جامعۂ عثمانیہ کے نام

اے کہ ارضِ علم و حکمت، مادرِ عثمانیہ
تجھ پہ قربان زندگی کا ہر نشاطِ ثانیہ
جلوہ گاہِ صاحبانِ علم کو میرا سلام
درس گاہِ طالبانِ علم کو میرا سلام
یہ کھنکتے قہقہے، یہ انجمن آرائیاں
تیرے پہلو میں ہیں کتنی زیست کی رعنائیاں
نت نئی آوازیں، فقرے، طنز، ہنگامے، چہک
اِن فضاؤں میں ہے جیسے چوڑیوں کی سی جھنک
بے نیازی فکر و غم کی تیرے دیوانوں میں ہے
کتنی رنگینی تیری محفل کے پروانوں میں ہے
رنگ و بُو کے یہ حسین لمحات جب یاد آئیں گے
زندگی کے مرحلوں میں کس قدر تڑپائیں گے
تو وجودِ مستقل ہے، زندۂ جاوید ہے
تو مآلِ تشنگاں ہے، چشمۂ امید ہے
رہنمائے راہِ حق ہے، نور کا مینار ہے
پیار کا، انسانیت کا، تو علمبردار ہے

فتنۂ دیر و حرم سے دُور ہے تیری نگاہ
آئینہ یکجہتی کا ہے بس تیری آماجگاہ
سرزمینِ جامعہ شاید تجھے معلوم ہے
تیری خاکِ پاک میں ہستی میری معدوم ہے
تیرے دامن سے ہوئی وابستہ میری زندگی
تیرے در پر لے کے آیا ہوں نیازِ بندگی
تیرے فردوسِ حسیں کی سیر کرنے آیا ہوں
دامنِ دل علم کے پھولوں سے بھرنے آیا ہوں
نغمہ خوانِ نرگس و ریحان و سنبل میں بھی ہوں
تیری شاخِ گلستاں کا ایک بلبل میں بھی ہوں
قطرۂ بے مایہ کتنے بن گئے لعل و گوہر
تیری ارضِ پاک کے ذرّے بنے شمس و قمر
کم سواد و کم نظر تھے جتنے دیدہ ور بنے
نونہالانِ چمن تیرے گُلِ دلبر بنے
ہوں لبِ خاموش کب سے جراتِ گفتار دے
طالبِ منزل ہوں میں بھی طاقتِ رفتار دے
ظلمتوں کی رہگذر میں روشنی کا نام ہے
تو جو میرِ کارواں ہے رہبری کا نام ہے

اپنے جلوؤں سے نگاہِ بارگاہِ طور کر
مادرِ علمی، مجھے بھی علم سے معمور کر

ڈھلتا سایہ

دل کی دنیا تھی بہ اندازِ دگر کل رات کو — میرے غم خانے میں تھا ان کا گزر کل رات کو

فکرِ درماں تھی نہ وہ پہلا سا تھا احساسِ درد — یعنی دردِ دل ہی تھا خود چارہ گر کل رات کو

ضَوفشانی رُخ کی اُس زلفِ پریشاں میں نہ پوچھ — شب کے پہلو میں سحر تھی جلوہ گر کل رات کو

اللہ اللہ! ذوقِ دل کی وہ کرشمہ سازیاں — حُسن صدقے ہو رہا تھا عشق پر کل رات کو

کیا تعین کی نظر میں جلوہ فرما تھا وہ حُسن — جم گئی تھی ایک مرکز پر نظر کل رات کو

کس غضب کی دھڑکنیں تھیں کس غضب کا اضطراب — ہو گئے تھے جان و دل زیر و زبر کل رات کو

کائناتِ عشق میں اُن کی نگاہِ مست سے — بے خودی چھائی ہوئی تھی سر بسر کل رات کو

اُن کی باہیں میری گردن میں حمائل دیکھ کر — جھومتے تھے باغ میں برگ و شجر کل رات کو

حُسن کو مدہوش پا کر میکدے میں عشق کے — ہو گیا تھا خود سے میں بھی بے خبر کل رات کو

صبح دم لیکن کھلی جب آنکھ تو غم خانہ تھا
ہر طرف حالات کا اُجڑا ہوا کاشانہ تھا
اب نہ وہ جلوہ نہ کوئی جلوۂ مستانہ تھا
کھویا کیا کیا میں نے پایا سوچ کا یارا نہ تھا
وقت کے بے رحم ہاتھوں میں بھلا کیا کیا نہ تھا
"خواب تھا جو کچھ بھی دیکھا جو سُنا افسانہ تھا"

اُڑتا اُڑتا رنگِ رُخ ہوں اب تو ایسے روپ میں
ڈھلتا ڈھلتا جیسے سایہ دن کی چڑھتی دھوپ میں

حضرت افضل بیابانیؒ کی مزار پر...

نہ جانے کیوں یکایک دیدۂ تر کر دیا کس نے
چراغِ شوق سینے میں منوّر کر دیا کس نے
دھندلکا پھر سے خوابوں کا اجاگر کر دیا کس نے
میرا دل بوئے الفت سے معطّر کر دیا کس نے

ارے اس آستاں کی یہ کوئی سوغات ہے شاید
کہ دل اس واسطے معمورِ جذبات ہے شاید

سلامِ شوق لاکھوں تم پہ اے افضل بیابانی
درود و فاتحہ تم پر بصد جذبِ فراوانی
زہے قسمت اگر یہ ہوں قبول اے نورِ ایمانی
تمھاری نذر ہیں کچھ پیار کے گلہائے روحانی

نگاہِ قدر ہیں سب واقفِ رازِ مشیت ہے
تمھاری ذات میں پوشیدہ سرِّ نورِ وحدت ہے

تمھارے در پہ میں اک شاعرِ گمنام آیا ہوں
سنانے زندگی کا قصۂ آلام آیا ہوں!
چھپا کر چشمِ نم میں ظلمتِ ایام آیا ہوں
ہے میرا زخم، زخمِ گل میں گل اندام آیا ہوں

اگر بہرِ خدا سن لو جو تم یہ داستاں میری
رہین سجدہ ہو جائے جبینِ آستاں میری

جہاں چھائی ہوئی ہر سو بہارِ دین ہوتی تھی
جہاں پر حق پرستی کی سدا تلقین ہوتی تھی
جہاں آپس میں ہر ایثار سے تسکین ہوتی تھی
جہاں ملت خدا کے پیار کی شوقین ہوتی تھی

وہاں پھر دیکھئے قوم آپ کی بے دین ہوتی ہے
دکن کی سرزمین پر کفر کی تلقین ہوتی ہے

دلوں کی دھڑکنوں کو آج پھر سے تیز تر کر دو
دفورِ درد سے پھر مضطرب قلب و جگر کر دو
سکون و تعطف کی دنیا کو پھر زیر و زبر کر دو
خبر دے کر خودی کی ہم کو خود سے بے خبر کر دو

حقیقت کی تجلی سے دلوں کو کردو نورانی
ہمیں دنیا میں پھر افضل کرو افضل بیابانی

●

ایک دوست کے عید ملنے پر!

بعد مدت آج جو تشریف تم لے آئے ہو
مجھ سے شاید عید ملنے کی غرض سے آئے ہو
آہ! لیکن کیا بتاؤں میرا کیا عالم ہے آج
میری ہر اِک سانس گویا نالۂ پیہم ہے آج
ویسے ہنسنے کو تو ہنس سکتا ہوں میں بھی ہمنشیں
کیا کروں لیکن تصنّع میری فطرت میں نہیں
دیکھتا ہوں جب تماشے گردشِ ایام کے
گریۂ پیہم سے رہ جاتا ہوں دِل کو تھام کے
اِک دو راہے پر رواں ہے کاروانِ زندگی
زندگی اِک سمت، اِک جانب گمانِ زندگی
اِک طرف مسرور دنیا صبح کا ہنگام ہے
اِک طرف مغموم دنیا بے کسی کی شام ہے

اِک طرف نظارۂ سرمستی و بادہ کشی
اِک طرف نظارۂ مجبوری و تشنہ لبی
اِک طرف ارماں بھری جوشِ جوانی کا جلال
اِک طرف مفلس جوانی فقر و فاقہ سے نڈھال
اِک طرف زینت بدن کی قیمتی پوشاک ہیں
اِک طرف ناداریوں سے جیب و داماں چاک ہیں
کیا بتاؤں تشنگانِ شوق کے لیل و نہار
"درد کی تصویر ہیں یا بے بسی کے شاہکار"
جی رہے ہیں غم کے مارے اِس طرح آفات میں
شمع جیسے جھلملائے آندھی اور برسات میں

زندگی کا مژدہ ہے یا موت کا پیغام ہے
عید کی یہ صبح ہے یا رنج و غم کی شام ہے

ساون کا گیت

برکھا رُت ہے مست پون ہے
پیاسا پھر بھی میرا من ہے

ساون آیا یاد دِلانے
بھولے بسرے سپنے سہانے
آشاؤں کا مینہ برسانے
گگری گگری جَل چھلکانے

بھیگا بھیگا ہر آنگن ہے
برکھا رُت ہے مست پون ہے

ڈالی ڈالی پھول سجیلے
منظر منظر مست نشیلے
گلشن گلشن گیت رسیلے
ناچے من کے مور رنگیلے

تیرے بنا پر کیا جیون ہے
برکھا رُت ہے مست پون ہے

تیرا درشن، چلمن چلمن
من کا درپن روشن روشن
پھر وہ سمے وہ پچھلا جیون
آجا لے کر میرے [illegible]

تیری دھن ہے تیری لگن ہے
برکھا رُت ہے مست پون ہے

چنچل نینا، رُت پھلواری
شوخ ادائیں دھار کٹاری
ناگن ناگن، کاکل ساری
پریم کی بازی میں سب ہاری

تجھ بن باولی بیراگن ہے
برکھا رُت ہے مست پون ہے

اپنے پیا کا درشن کرکے
من مندر کی بن کے پجارن
ہو گئی ہر اک سجنی سہاگن
جنم جنم کی پر میں ابھاگن

تو ہی میرا تن من دھن ہے
برکھا رُت ہے مست پون ہے

دھن کی دھرم کی رسم مٹا رے
پریم کی سُکھ کی بنسی بجا رے
ساون آیا، آجا پیارے
جیانہ لاگے تیرے بنا رے

پیار دھرم ہے میرا بھجن ہے
برکھا رُت ہے مست پون ہے

ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی
پیار کے بندھن میں سب بھائی
پھول کے گجرے کی پروائی
دیش ہے اپنا ایک اکائی

سب کے دھرم کا گنگ وجمن ہے
برکھا رت ہے مست پون ہے

آجا ساجن مل کے گائیں
پیار کے میٹھے بول سنائیں
مندر، مسجد دیپ جلائیں
گھپ اندھیارے دل کے مٹائیں

پھولوں کا یہ بھارت بن ہے
برکھا رت ہے مست پون ہے
پیاسا پھر بھی میرا من ہے

●

عید کا گیت

عید آئی ہے عید آئی ہے
رحمتوں کا پیام لائی ہے
آسمانوں سے نور اُترا ہے
یوم لطف و نشاط آیا ہے
اس طرف آئے وہ جو پیاسا ہے
جوش پر رحمتوں کا دریا ہے

آج تقدیر مسکرائی ہے
عید آئی ہے عید آئی ہے

رُت جگوں کی نماز کی راتیں
سوز و ساز و گداز کی راتیں
ذکرِ بندہ نواز کی راتیں
ناز کی اور نیاز کی راتیں

نورِ صبح امید لائی ہے
عید آئی ہے عید آئی ہے

روزہ دارو خوشی مناؤ آج
جنتوں کی نوید پاؤ آج
غم گناہوں کے بھول جاؤ آج
اک نئی زندگی سجاؤ آج

رت بہاروں کی جیسے چھائی ہے
عید آئی ہے عید آئی ہے

آج تو خار و گل بھی ہیں باہم
ایک ہیں جیسے شعلہ و شبنم
ہندو مسلم ملاپ ہے پیہم
دیس اپنا دلوں کا ہے سنگم

سب نے مل کر خوشی منائی ہے
عید آئی ہے عید آئی ہے

قبائے تغزل

(غزلیں)

غزل کلیمؔ پہن کر قبا تغزل کی
شعور و فکر کے دستِ ہنر سے آئی ہے

آج یہ ہوا ظاہر تیرے ہمنشینوں سے
حسنِ تختِ جمہوری گم ہے شہ نشینوں سے

یہ ہے بزم جلووں کی زخم کے چراغوں کی
روشنی نگاہوں کی چھن رہی ہے سینوں سے

بغض، دشمنی، کینے، زہر سے بھرے سینے
آج بھی ہیں وابستہ سانپ آستینوں سے

چشمِ نم میں دیکھے ہیں عکسِ چشمِ نم کتنے
آئینے جھلکتے ہیں دِل کے آبگینوں سے

دِل سے دِل کی منزل تک آج بھی اندھیرا ہے
بندگی کا جھلکا ہے نور تو جبینوں سے

خواب ماہ و انجم کے گل مہکتے زخموں کے
ہم کو بھی ملے تحفے درد کے قرینوں سے

بحرِ فن کی موجوں پر ہیں حباب لفظوں کے
باز آئے ہم ایسی فکر کے سفینوں سے

بچ گیا کلیمؔ آخر گلشنِ شعور اپنا
لاکھ زلزلے اٹھے رشک کی زمینوں سے

●

دِل کو شعاعِ حسن و ادا کہہ دیا گیا
زُلفوں کو تیری شب کی رِدا کہہ دیا گیا

بے ساختہ زبان سے کیا کہہ دیا گیا
عرفانِ ذات ہی کو خدا کہہ دیا گیا

دردِ وفا کو حسنِ عطا کہہ دیا گیا
ہر زخمِ دِل کو گُل کی ضیا کہہ دیا گیا

آئینۂ حیات کی ہر احتیاط کو
عکسِ تجلّیاتِ اَنا کہہ دیا گیا

ہنگامۂ فساد بپا ہو گیا جہاں
اپنا دھاں پہ نام سدا کہہ دیا گیا

اِس دَورِ بے حسی میں صدائے ضمیر کو
اکثر توہمات بَلا کہہ دیا گیا

غم ہو کہ یا خوشی ہو ہر اک اعتبار کو
قسمت کی خوبیوں کا لکھا کہہ دیا گیا

پُرسانِ حالِ غم رہی جب تک اُٹھی رہی
جھکتی ہوئی نظر کو دعا کہہ دیا گیا

تکمیلِ ذوقِ مے کے ہر آغاز پر کلیمؔ
آنکھوں کو جامِ شب کو گھٹا کہہ دیا گیا



شہرِ جفا میں ذوقِ ترحّم لیے پھرا
خُم خانۂ حیات کے میں خُم لیے پھرا

بحرِ شکوں میں شورِ تلاطم لیے پھرا
ہر حادثے سے لطفِ تصادم لیے پھرا

پھرتے تھے تنگ دِل تہی داماں لیے مگر
اِک میں ہی تھا جو پیار کا قلزم لیے پھرا

دِل سے نگاہ تک ہے میرے غم کی تیرگی
ہر سمت پھر بھی شمعِ تبسم لیے پھرا

تاریکیٔ انا ہی میں کچھ لوگ ہیں مگن
بیکار میں نگاہوں میں انجم لیے پھرا

سنتے نہیں جو اپنی صدائے ضمیر بھی
کیوں اُن میں اپنا سوزِ ترنم لیے پھرا

خوش فہمیوں کی فصل ہے یہ کتنی دلفریب
جَو بو کے بھی میں خواہشِ گندم لیے پھرا

تہذیب و ارتقا کے اُجالوں کے باوجود
ظلماتِ دل میں خوف توہّم لیے پھرا

اربابِ ناشناس کی محفل میں اے **کلیم**
میں اپنا طرزِ حُسنِ تکلّم لیے پھرا

●

ہے داغ داغ کتنا مگر بولتا نہیں
یہ چاند بھی تو اپنا بھرم کھولتا نہیں

بازار میں ہوس کے ہے جسموں کا مول تول
اب زندگی میں پیار بھی رس گھولتا نہیں

کیا پتھروں کا عہد مجھے راس آگیا
کوئی گہر پرکھتا نہیں، رولتا نہیں

بے سمجھے جو زبان پر آیا وہ کہہ دیا
کہنے سے پہلے بات کوئی تولتا نہیں

ہنگامۂ حیات میں کھویا ہوا دماغ
تنہائیوں میں فکر کے در کھولتا نہیں

خوابوں کی جھیل میں ہے قیامت بپا کلیم
دِل اب کسی کنول کی طرح ڈولتا نہیں

ساغر بدوش یوں تو نظر ہر گھڑی رہی
ہم تشنگانِ غم کی وہی تشنگی رہی

شاید کہیں خلوص میں کوئی کمی رہی
روشن ہوئے چراغ مگر تیرگی رہی

تعمیر آشیاں کا تو کا کب ہے سلسلہ
ہر بار برق گرتی رہی، کوندتی رہی

جو گل جنوں میں تیرے دِوانے کھِلا گئے
برسوں بہارِ شوق انہیں ڈھونڈتی رہی

اس زندگی کی دھوپ میں اکثر کہیں کہیں
زلفوں کی بھیگی چھاؤں بھی کچھ شبنمی رہی

گزری ہے کب ہماری شبِ غم ترے بغیر
جھولے میں دِل کے یاد تیری جھولتی رہی

انداز موجِ وقت سمجھتی ہے وہ نظر
اکثر بھنور کی آنکھ سے جو جھانکتی رہی

دِل کے چراغ آخرِ شب اس طرح جلے
اپنا پتہ نویدِ سحر پوچھتی رہی!

رشتے جنم جنم کے حوادث سے ہیں کلیمؔ
دنیا کے زیر و بم میں میری زندگی رہی

●

ہم ساجاں نثار اُن کو پھر سے ڈھونڈنا ہوگا
وقت جیسے ظالم سے جب مقابلہ ہوگا

اب تو جو بھی ہنگامہ شہر میں بپا ہوگا
اپنا جرمِ ناکردہ موجبِ سزا ہوگا

وہ چلے ہیں محفل سے جوشِ سرفروشی میں
جیسے آج مقتل میں کوئی واقعہ ہوگا

شاخ شاخ لہرا کر آگ ساری بھڑکا کر
برق سوچتی ہے اب کیوں چمن جلا ہوگا

کچھ تو اے صبا بتلا میرے بعد گلشن میں
جشنِ گُل بپا اب کے کس طرح ہوا ہوگا

پیار کیا، مصیبت کیا، اعتبارِ راحت کیا
ہم بھی سب سمجھتے تھے کب وہ با وفا ہوگا

وقت خود بتا دے گا گردشِ جہاں کیا ہے
وقت کے اسیروں کا وقت آئینہ ہوگا

لاکھ مسخ کر ڈالیں وہ حقائقِ تاریخ
عہدِ نو کی راہوں میں اپنا نقشِ پا ہوگا

شب نے بھیگی زلفوں سے سب جھٹک دیے تارے
دیکھ اِن گھٹاؤں سے دِن نکل رہا ہوگا

ذِکر اُن کی محفل میں اور پھر کلیمؔ اپنا
رشک کی زمینوں میں آج زلزلہ ہوگا!

دل ہے دھواں ابھی ذہن میں ہے گھٹن ابھی
جلتے ہیں غم کی آگ میں خوابوں کے گلبدن ابھی

یوں تو ہے جاذبِ نظر حُسن کی انجمن ابھی
نبضِ حیات میں مگر زخم ہیں خندہ زن ابھی

مِل نہ سکا خیال کو لفظ پیرہن ابھی
آپ سے ہے سجا ہوا گلشنِ فکرِ فن ابھی

کہتے تھے وہ کہ لائیں گے رنگِ بہار میرے بعد
کیوں نہ پھر اے صبا ہوئی خاک چمن چمن ابھی

کتنے نقاب اُلٹ گئے حسرتِ خود نمائی میں
کوئی میری حیات کا پا ما نہ بانکپن ابھی

میرے بغیر حسن کے لاکھ وہ گُل کھلائیں گے
پھر بھی مری وفاؤں کے مہکیں گے پھول بن ابھی

بزمِ جنوں سجے کہاں، تیغِ خرد ہے خوں فشاں
کیجئے شغلِ جام کیا، وقت ہے دل شکن ابھی

کشمکشِ حیات سے سنبھلے بھی ہم تو اس طرح
فکر و شعور مضمحل، ذہنوں میں ہے تھکن ابھی

ہند کی ہر زبان گو شیریں سہی ہے مگر کلیمؔ
اُردو کی طوطیوں سے ہے شکر فشاں دکن ابھی

●

کہیں رنگیں اجالے ہیں کہیں ظلمات ملتے ہیں
نگاہِ شوق کو جلوے عجب دن رات ملتے ہیں

وہ عالم ہے تغیر کا کہ ہر اک گام پر جیسے
نیا ماحول ملتا ہے نئے حالات ملتے ہیں

خلوص و مصلحت کا روپ دھارے زندگانی میں
کئی محشر بداماں فتنۂ جذبات ملتے ہیں

یہ غم خانہ ہے ساقی یا نگاہوں کا ہے میخانہ
ہر اک ساغر میں کتنے زخمِ احساسات ملتے ہیں

اجالے غم کی نظروں کے مہکتے پھول زخموں کے
میرے اخلاص کو اکثر یہی سوغات ملتے ہیں

شبِ غم ٹوٹنے لگتے ہیں جب انجم نگاہوں سے
مجھے پھر آپ خوابوں کی یہ بارات ملتے ہیں

خِرد اسرارِ مہر و ماہ میں گم ہے ابھی لیکن
جنوں کو کتنے انوارِ حیات و ذات ملتے ہیں

چلے ہو اب کہاں اپنے لہو کی روشنی لے کر
یہاں انسان جیسے صورتِ آفات ملتے ہیں

کلیمؔ اب کوئی ہنگامہ ہو تو حسنِ عدالت سے
زمانے بھر کے سارے ہم کو الزامات ملتے ہیں

●

ساری دنیا کہہ گئی دیوانۂ عالم مجھے
اک تسلسل بن گیا پیغامِ چشمِ نم مجھے

ہر طرف ہیں وقت کے شعلے بہت بکھرے ہوئے
کیا ضروری ہے ہوائے کاکلِ برہم مجھے

دل شکن ہیں الجھنیں پھر بھی شعورِ زندگی
کر گیا ہے بے نیازِ فکرِ بیش و کم مجھے

مجھ سا محسنِ کشمکش پایا نہ طوفانوں نے پھر
ڈھونڈتے ہیں آج بھی موجوں کے پیچ و خم مجھے

بے بسی کب چھا سکی عزم و تبسم پر میرے
کر گئے گو نیم جاں دنیا کے زیر و بم مجھے

فصلِ گُل ہے عام لیکن اپنی اپنی جستجو
شعلۂ دامن ملا سب کو گُل شبنم مجھے

زندگی کی آگ میں جلتے ہیں ایسے پیار بھی
جن کے دَرد و غم سے بھی ہے رشتۂ باہم مجھے

میرا ذوقِ بادہ نوشی مجھ کو لے آیا کہاں
یاد فرمائے گی صدیوں بزم جام جم مجھے

شکوۂ جورِ زمانہ جن کا شیوہ ہے کلیمؔ
اب وہ سمجھانے لگے آدابِ ضبطِ غم مجھے

●

آرزوؤں کے سفر کا سلسلہ کوئی نہیں
دل سے دِل کی منزلوں تک راستہ کوئی نہیں

ہر طرف ہے یوں تو رنگ و بو گلستاں میں مگر
جس کو کہتے ہیں بہارِ جانفزا کوئی نہیں

اپنے شوقِ خود نمائی میں مگن ہیں دیدہ ور
آئینے میں وقت کے اب جھانکتا کوئی نہیں

رشکِ مہر و ماہ ہیں رشکِ بہاراں ہیں مگر
اِن گلوں میں حُسن کے بوئے وفا کوئی نہیں

یوں ہیں نازاں باطلوں پر دوستانِ اہرمن
جیسے اب ہم حق پرستوں کا خدا کوئی نہیں

آج بھی اس تیرگیٔ راہِ نو میں دور تک
ہم سے آگے روشنیٔ نقشِ پا کوئی نہیں

جس میں آجائیں نظر چہرے نقابوں کے مجھے
کیا کسی کے پاس ایسا آئینہ کوئی نہیں

کتنی صبحوں نے جگائے کتنی راتوں کے نصیب
اس شبِ غم سے سحر کا واسطہ کوئی نہیں

اِس بہارِ جلوۂ شہرِ نگاراں میں کلیم
اپنے خوابوں کا مہکتا گل کدہ کوئی نہیں

کچھ بھی نہیں تھا صرف گماں آشنا کا تھا
گہوارۂ خیال کو جھونکا ہوا کا تھا

نغمہ سرا تھا دور تلک کوئی میرے ساتھ
انداز تیری لے، تیری شعلہ نوا کا تھا

جس روشنی نے مجھ کو بتایا ہے راستہ
دیکھا تو وہ چراغ میرے نقشِ پا کا تھا

اس دورِ خود نمائی کے جلوؤں کی بھیڑ میں
زخمی ہر ایک وقت کے سنگِ جفا کا تھا

دِل تو رہا ہمیشہ گناہوں سے رو سیاہ
جسمِ ہوس پہ جامہ مگر پارسا کا تھا

خود اپنے دِل کو سمجھے ہو تم دِل میرا اگر
اِس آئینہ میں عکس تمھاری انا کا تھا

رنگِ چمن پہ آج نظر غور سے پڑی
دیکھا ہر ایک گُل میرے زخمِ وفا کا تھا

تھا پُرفریب جلوۂ دوراں مگر کلیمؔ
چشمِ گناہگار میں جلوہ خدا کا تھا

●

جلوہ گلوں کا ہو بہو خارِ چمن کا ہے
لیکن سلوک سب وہی دل کی چبھن کا ہے

اب ہم ہیں اور ہجوم غمِ دل شکن کا ہے
اک خواب سا نگاہ میں حسنِ دکن کا ہے

گلشن میں رنگ و بو ہے نہ پھولوں پہ ہے نکھار
اب کے عجیب رنگ بہارِ وطن کا ہے

شہرِ بتاں میں حسن کا چرچا تو ہے مگر
سنگِ گراں نگاہ کا شیشہ بدن کا ہے

شاہین، شاہباز، عقاب و ہما کہاں
اب سلسلہ چمن میں تو زاغ و زغن کا ہے

خوشبوئے فکر و فن پہ شبِ غم نہ چھا سکی
ہر جھونکا مشک بارِ شمیمِ سخن کا ہے

کیا بات ہے کہ شانِ جنوں ہم میں اب نہیں
یوں تذکرہ تو ہونٹوں پہ دار و رسن کا ہے

تاریکیوں میں اب بھی یہ رنگِ سحر کلیمؔ
پرتو ہر ایک سمت میرے فکر و فن کا ہے

●

تبسموں کے اجالوں کا سلسلہ رکھنا
غمِ حیات کی تاریکیاں چھپا رکھنا

صدائے تیشہ و عزم جواں رہے جاری
ہر اک زخم گلوں کی طرح سجا رکھنا

ہماری بزم میں غم کے بہت اندھیرے ہیں
دِلوں کے بیچ چراغِ وفا جلا رکھنا

رہِ ستم سے سرِ دار سے گزرنا ہے
تم اتنی دیر ذرا حوصلے بڑھا رکھنا

جہاں بھی جائیے سنگِ جفا برستے ہیں
کسی کے سامنے کیا دِل کا آئینہ رکھنا

خفا خفا سہی یہ بھی ہے اک ادائے حیات
ہمارا ذکر بھی کچھ شاملِ دعا رکھنا

سنا ہے کوئی دبے پاؤں آنے والا ہے
دریچہ دل کا سرِ شام تم کھلا رکھنا

بہت عزیز ہے پھولوں کو خار کا پہلو
کہ دوستی میں بھی کچھ دشمنی روا رکھنا

اِن آنسوؤں سے بھی اظہار ہو نہ جائے کہیں
کلیمؔ عشق کی تم آبرو بچا رکھنا

●

عجیب قتل کا منظر دکھائی دیتا ہے
ہلالِ عید بھی خنجر دکھائی دیتا ہے

یہ معجزات رُخِ ارتقا معاذ اللہ
ہر ایک جلوہ پیمبر دکھائی دیتا ہے

لبوں پہ نغمۂ امنِ حیات ہے لیکن
دِلوں میں فتنۂ محشر دکھائی دیتا ہے

اب اپنے عہدِ وفا کا ہر اک حسیں لمحہ
رگوں میں ٹوٹتا نشتر دکھائی دیتا ہے

خیالِ عشرتِ فردا تجھے خدا رکھے
ہجومِ غم میں تو اکثر دکھائی دیتا ہے

یہ قتل و خون یہ لاشیں یہ آگ نفرت کی
اسی کھنڈر میں میرا گھر دکھائی دیتا ہے

کلیم آئینۂ دل لیے کہاں جائیں
ہر ایک ہاتھ میں پتھر دکھائی دیتا ہے



غم کدے اس طرح خوابوں سے سجے رہتے ہیں
جس طرح پھول مزاروں پہ رکھے رہتے ہیں

ترکِ اُلفت سے کہاں ٹوٹے ہیں رشتے دل کے
اشک بن بن کے نگاہوں سے جڑے رہتے ہیں

تیری پلکوں کے ابھی تک وہ شہابِ ثاقب
روشنی اپنی شبِ غم کی بنے رہتے ہیں

جل چکے دل کے تراشے ہوئے پیکر کتنے
پھر بھی کچھ راکھ تلے شعلے دبے رہتے ہیں

پھول بن کر جو بسے رہتے ہیں دل میں اکثر
وقت پڑنے پہ وہ خنجر بھی کھنچے رہتے ہیں

وہ جو ہر زخم پہ کل ہنستے رہے گُل کی طرح
اب مری قبر پہ کیوں روتے کھڑے رہتے ہیں

جستجو تھی کسی گُل کی نہ ملا یوں تو کلیمؔ
خیمۂ گُل کئی راہوں میں سجے رہتے ہیں



جب رات کے شعلوں میں دن کے سب خواب پگھلتے رہتے ہیں
چپ چاپ درِ دل پر میرے کیوں آپ ٹہلتے رہتے ہیں

طوفان و حوادث یوں تو کئی اٹھ اٹھ کے چلے آتے ہیں مگر
پُرعزم سفینے ہمت کے ہر حال میں چلتے رہتے ہیں

لیتا ہے زمانہ جب کروٹ، چلتی ہے ہوا جب تیز بہت
حالات کے ہر اک سانچے میں انسان بھی ڈھلتے رہتے ہیں

غم ہے نہ مسلسل عشرت ہے، دنیا کی بدلتی صورت ہے
رہتا ہے وہی میخانہ مگر پیمانے بدلتے رہتے ہیں

پھولوں سے محبت عام سہی کانٹوں کو بھی ہم نے پیار کیا
کچھ لوگ ہیں ایسے دانستہ کلیوں کو مسلتے رہتے ہیں

یہ بات بھی ہے اب غور طلب جب شرط اجالا ہی ٹھیرا
پروانے مگر سورج پہ نہیں کیوں شمع پہ جلتے رہتے ہیں

یہ عالمِ لغزش بھی ہے عجب ہر سمت یہاں ہیں پست و بلند
کچھ لوگ سنبھلتے گرتے ہیں کچھ گرتے سنبھلتے رہتے ہیں

نکلے ہو کہاں دل ڈھونڈھنے اب یہ شہر نہیں دل والوں کا
شیشوں کی چٹانوں میں تو یہاں پتھر ہی نکلتے رہتے ہیں

کیا کہئے کلیمؔ افسانۂ غم جب چلتی ہے بادِ جمہوری
جلتے ہوئے گھر کے شعلوں سے ہمسائے نکلتے رہتے ہیں

●

میرے جذبات، میری فکر و نظر تک آؤ
پھر ذرا آپ میرے دل کے نگر تک آؤ

مجھ سے پھر پوچھنا رودادِ بہاراں کیا ہے
آؤ پہلے میرے جلتے ہوئے گھر تک آؤ

نغمۂ زیست کناروں سے سنانے والو
کبھی طوفان و حوادث کے بھنور تک آؤ

روئے روشن سے رہے کچھ تو شبِ غم کا بھرم
دو قدم ساتھ ذرا بزمِ سحر تک آؤ

اپنی زلفوں کا حسیں شبنمی سایہ لے کر
زندگی کی کڑی دھوپوں کے سفر تک آؤ

ظلمتِ شب کی یہ تنہائی مجھے ڈستی ہے
روشنی بن کے کبھی دیدۂ تر تک آؤ

کون تاروں کی طرح ہوتا ہے ساتھی غم میں
آؤ اس پار اندھیروں کی گزر تک آؤ

محفلِ شعر و سخن بٹ گئی خانوں میں کلیمؔ
تم جو آؤ تو چمن زارِ ہنر تک آؤ



شعلے ہیں شرارے ہیں پھولوں کے نقابوں میں
چشمے ہیں ہوس کے ہیں آنکھوں کے سرابوں میں

برسوں سے جلیں پھر بھی جلنے ہی نہیں پائیں
یہ کیسی ہیں تحریریں ماضی کی کتابوں میں

گو ہم کو مٹاتے ہیں لاکھ اہل چمن پھر بھی
باقی ہی وفاؤں کی خوشبو ہے گلابوں میں

کیوں اجڑی زمینوں پر چلتی ہے صبا پھر بھی
کیا خاک اڑائے گی ہم خانہ خرابوں میں

پھانسی ہے صلیبیں ہیں مقتل ہے جفائیں ہیں
کیا اور کچھ ہیں باقی دنیا کے عذابوں میں

اشکوں کا تسلسل ہے اک آگ مسلسل ہے
ساون کی ہیں برساتیں جلتے ہوئے خوابوں میں

ہوتی ہیں دلوں کی یوں باتیں بھی کلیم اکثر
کچھ اشک سوالوں میں کچھ اشک جوابوں میں

وابستہ حادثات تھے گو میرے دم کے ساتھ
گزرا ہوں ہر مقام سے پھر بھی بھرم کے ساتھ

ہر صبحِ نو شریک ہے شامِ الم کے ساتھ
پھوٹی کرن کرن مری نوکِ قلم کے ساتھ

وہ قدر دانِ اہلِ وفا، اہلِ دل کہاں
اب آزمائش اپنی ہے اہلِ ستم کے ساتھ

کم ہو نہ جائیں پھر غمِ دوراں کی تلخیاں
کچھ شغلِ جام بھی رہے چشمِ کرم کے ساتھ

یوں تو رواں ہے زیست کڑی دھوپ میں مگر
سایہ فگن ہے اُن کی نظر ہر قدم کے ساتھ

کیوں نفرتوں کی راہ پہ چلنے لگے ہیں لوگ
جب عمر پیار میں کٹی دیر و حرم کے ساتھ

میں بھی وہی، وفا بھی وہی، زندگی وہی
بدلے ہیں آپ اپنے ہی قول و قسم کے ساتھ

اُلٹا نہ دوں کہیں یہ بساطِ ستم گری
اب اور کھیلئے نہ میرے ضبطِ غم کے ساتھ

طوفان، آگ، بجلیاں، سیلاب، زلزلے
نکھری میری حیات ہر اک زیر و بم کے ساتھ

زخموں کا عکس خود نظر آجائے گا کلیمؔ
دیکھو کبھی تو آئینہ تم چشمِ نم کے ساتھ

●

نظر بھی ساتھ رہے اور شغلِ جام چلے
پلائے جاؤ کہ تشنہ لبوں کا کام چلے

ادائے شوق کی پھر تیغِ بے نیام چلے
شہر میں تیری بلا سے جو قتلِ عام چلے

دیارِ کوچۂ جاناں سے غم کی راہوں تک
تلاشِ ذات میں ہم زندگی تمام چلے

چمن چمن میں کھلا کر گلاب زخموں کے
ہم آج کرکے بہاروں کا اہتمام چلے

نگارِ خوابِ بہاراں کے آئینے لے کر
غمِ حیات کے لمحے تبک خرام چلے

نگاہِ یار کی نیرنگیاں خدا رکھے
یہی ادائیں یہی انداز صبح و شام چلے

کلیمؔ بزمِ سخن میں انا پرستوں کی
تم اپنے درد کا لے کر کہاں کلام چلے



گلوں کا پیار بھی کانٹوں کا انتقام بھی ہے
بڑا عجیب گلستاں کا یہ نظام بھی ہے

فریبِ خواب سہی صبحِ آرزو لیکن
بہت سہانی ترے گیسوؤں کی شام بھی ہے

اٹھا کے سر نہ چلو یوں غرور سے ورنہ
نگاہِ وقت یہاں تیغِ بے نیام بھی ہے

الٰہی آبروئے عشق کی وفا کی خیر
لبوں پہ اہلِ ہوس کے جنوں کا نام بھی ہے

شرافتوں کے جنازے اٹھائے جاتے ہیں
ہمارے عہد کا شاید یہ اختتام بھی ہے

یہ سچ نہیں کہ روایت شکن نہیں ہم لوگ
مگر یہ سچ ہے کہ ماضی کا احترام بھی ہے

نہ جانے دل نہیں کیوں گلفشاں کلیمؔ اب کے
چمن میں یوں تو بہاروں کا اہتمام بھی ہے

●

لو بڑھا جاتی ہے زخموں کی صبا شام کے بعد
جگمگاتے ہیں چراغانِ وفا شام کے بعد

آگ چھڑکی گئی جلتی ہوئی تنہائی پر
سرسرائی تیری زلفوں کی ہوا شام کے بعد

دِل کے جلتے ہوئے شہروں سے پرے دور کہیں
تیری لے میں تھا کوئی نغمہ سرا شام کے بعد

دِن کے ہنگاموں کی ہر چوٹ جواں ہوتی ہے
پھر سنبھلتی ہے میری لغزشِ پا شام کے بعد

صبح جاگی تو مہکنے لگے زخموں کے گلاب
غم کی پلکوں پہ جلی دِل کی چتا شام کے بعد

ذہن خوابوں کی صلیبوں پہ لٹکتا ہی رہا
جھنجھناتی رہی زنجیرِ جفا شام کے بعد

یہ دکن، یہ لبِ موسیٰ، یہ صنم زار کلیم
عمرِ رفتہ مجھے دیتی ہے صدا شام کے بعد



حادثاتِ زخمِ گُل جب چمن چمن لکھوں
رنگِ موسمِ گلشن کیا میرے وطن لکھوں

اس سکوتِ پیہم کو حاصلِ سخن لکھوں
یا تیری طبیعت کا اس کو بانکپن لکھوں

شامِ غم نہ لکھو جائے آبرو اُجالوں کی
ذکرِ صبحِ رخ تیرا ایں کرن کرن لکھوں

بے سکون و شوریدہ، غم نصیب و افسردہ
زندگی تجھے کب تک نعشِ بے کفن لکھوں

رشک، دشمنی، کینے، پتھروں کے ہیں سینے
ان بتوں کو میں کیونکر کانچ کے بدن لکھوں

ہائے رے یہ خوش بختی کشتگانِ اُلفت کی
تشنہ لب میں لکھوں یا بحرِ موجزن لکھوں

خون سا ٹپکتا ہے اب قلم کے سینے سے
کیسے آج تاریخِ خطۂ دکن لکھوں

زندگی کے فنکارو عہدِ نو کے معمارو
کیوں نہ فکر و کاوش کو نقدِ جان و تن لکھوں

جسم کی یہ عریانی ہے گراں نگاہوں پر
میں کلیمؔ کس دل سے اس کو پیرہن لکھوں

●

سائلِ وقت ہیں دامانِ کرم دیکھیں گے
ہم ترے دستِ تصرّف کا بھرم دیکھیں گے

حادثے کتنے مقابل ہیں یہ ہم دیکھیں گے
اور کب تک ہے یہ طوفان میں دم دیکھیں گے

سرفروشانِ وفا ہم تو ازل سے ہیں مگر
کتنی خوں ریز ہے یہ تیغِ ستم دیکھیں گے

ہم نے راہوں کو اجالے تو دیئے دورِ خرد
کتنے روشن ہیں ترے نقشِ قدم دیکھیں گے

ذکر جب اپنے ہر اک زخم [illegible] کا ہو گا
گل فشانی سی سرِ لوح و قلم دیکھیں گے

زندگی خواب سہی تیری تمنّا پھر بھی
عمر بھر تیرے تصوّر کے صنم دیکھیں گے

جانے کس موڑ پہ لے آئی ہمیں کربِ حیات
اب نہ وہ زلف نہ وہ زلف کے خم دیکھیں گے

پیار، ہمدردی، وفا، مہر و مروّت، اخلاق
جو بھی دیکھیں گے اب اس دور میں کم دیکھیں گے

اپنے ہی خوں سے چمک اٹھے کی تاریخ کلیمؔ
عہدِ حاضر کے جو ماتھے پہ رقم دیکھیں گے



ارتقائے جہاں خدا جانے
کیا دکھائے سماں خدا جانے

خوف سے ہے زمین دل لرزاں
کب گرے آسماں خدا جانے

کتنا روشن ہے عہدِ نو پھر بھی
دل ہے کیوں بدگماں خدا جانے

ہر جگہ دہر میں ہے انتشار
کس جگہ ہے اماں خدا جانے

جو ملا غمزدہ ملا ہم سے
کون ہے شادماں خدا جانے

شہرِ ارماں میں حشر ہے برپا
کون آیا یہاں خدا جانے

پھر وہ ہوتے ہیں مہرباں ہم پر
پھر ہو کیا ناگہاں خدا جانے

پھر نئی ہو رہی ہیں تعمیریں
پھر جلیں کب مکاں خدا جانے

زندگی میں تھے جن سے ہنگامے
یار ہیں وہ کہاں خدا جانے

اختلافات میں تیرے میرے
کون ہے درمیاں خدا جانے

اب کلیمؔ اپنی زندگانی بھی
کیوں ہے بارِ گراں خدا جانے

●

وہ خواب صبحِ نو نہ کرن خواہشات کی
سورج کے رُخ پہ پھیل گئی زُلف رات کی

ہر جلوہ اپنی سوچ کے زنداں میں قید تھا
اب کون کس کے واسطے سوچے نجات کی

تھی گفتگو کرم کی کسی اور کے مگر
سمجھا یہ اُس نے اُس کے تعلق سے بات کی

نس نس میں ہے بدن کی ہر اک تیرِ نیم کش
اب کونسی بچی ہے جگہ تیری گھات کی

تنہائیوں کی رات میں دل کی فصیل پر
مشعل جلا گیا کوئی پھر التفات کی

وابستہ تیری ذات سے اک اور ذات ہے
پڑھتا ہے کیا کتاب گزشتہ حیات کی

قسمت نے تو نہ در پہ دی دستک کوئی مگر
بدلی ہے ہر لکیر مرے ہاتھ کی

پونم کی چاندنی میں تھرکتی ہیں ذہن میں
پرچھائیاں کلیمؔ حسیں واقعات کی

●

زندگی سے الفت ہے اور نہ موت پیاری ہے
شیشۂ گریزاں پر پھر بھی سنگ باری ہے

پھول چن رہے ہیں ہم مسکراتے زخموں کے
یہ نئی بہاروں کی پہلی زرنگاری ہے

بہہ چکی ہے اشکوں میں راکھ کتنے موسم کی
زندگی تیرا پھر بھی انتظار جاری ہے

کاش! خوابِ صبحِ نو کچھ طویل ہو جاتا
پھر وہی شبِ غم ہے، زہر بادہ خواری ہے

رشک، دشمنی، کینے، سرد منجمد سینے
یہ عجیب موسم کی دل پہ برفباری ہے

زد میں وقت کی جیسے ہیں محل بھی شیشوں کے
لمحہ لمحہ تیشہ ہے اور ضرب کاری ہے

ہے تغیر ہی ہم فطرت جہاں ورنہ
رات کب ہماری تھی صبح کب تمہاری ہے

کیا یہ میر و غالب کے ناقدوں سے ہم پوچھیں
اس ادب کے پودوں میں کس کی آبیاری ہے

تھے کلیم دن وہ بھی دھوپ تھی کہ جن کی
اب تو دل پہ پچھلے کی چاندنی بھی بھاری ہے

●

اک کرن تھی خوابوں کی شمعِ رہگزر تنہا
گم ہے اب سرابوں میں وہ بھی ہمسفر تنہا

دو گھڑی تسلی دے مل کے وہ اگر تنہا
پھر جو ہو وہ ہو اپنا حشر عمر بھر تنہا

بے کسی، حوادث، غم سب ہیں ساتھ ساتھ اپنے
اک ہے زندگی جیسے ہم سے بے خبر تنہا

کیا ستم ہے اب یارو عشق کی سرافرازی
ہر نظر کا پتھراؤ اور میرا سر تنہا

ختم ہو کہاں جانے عالمِ عدم یارب
راستے ہیں انجانے اور ہے سفر تنہا

جلنے ہم پہ کیوں پتھر پھینکتے ہیں لوگ آخر
کیا ہمیں شجر کا ہیں آخری ثمر تنہا

پڑ گئی تھی جو اک دن میری آتشِ غم پر
دل میں ہے وہی اب تک شبنمی نظر تنہا

آس کے اندھیروں میں اک کرن امیدوں کی
بادلوں کے ہالے میں جیسے ہو قمر تنہا

اور بھی سخنور ہیں اے کلیمؔ دنیا میں
آپ ہی نہیں ہیں اک صاحبِ ہنر تنہا



رسوائیوں میں گریۂ رنج و محن بھی جھوٹ
شبنم مثالِ چاند کا داغِ کہن بھی جھوٹ

حرص و ہوس کی بھیڑ میں کھوئے ہوئے ہیں لوگ
خودداریٔ مزاج کا ہر بانکپن بھی جھوٹ

ایثار و سرفروشیٔ پروانہ اِک فریب
سوز و گدازِ شمعِ سرِ انجمن بھی جھوٹ

لطفِ تعیّشات کا شوقِ طلب ہے عام
فکرِ معاش کے لیے ترکِ وطن بھی جھوٹ

وہ دن گئے کہ جب تھی قیادت صلیب سے
اب قائدوں سے نسبتِ دار و رسن بھی جھوٹ

اپنی روش کا جائزہ پہلے لیے بغیر
کہتے ہیں آپ ہم کو جو ننگِ چمن بھی جھوٹ

اس عہدِ ناشناس میں سچ تو یہ ہے کلیم
احساسِ قدر دانیٔ شعر و سخن بھی جھوٹ



قطعہ

پیار، ہمدردی، وفا، مہر، مروت، اخلاق
یکجہت ہونے کے جذبات ہم بانٹ چلو
منصبِ چارہ گری دیر و حرم سے چھینو
ہم ہیں انسان تو انسان کے غم بانٹ چلو



زندگی فرطِ حادثات سے ہے
موت آسائشِ حیات سے ہے

شامِ ظلمت ہے مفت میں بدنام
آبروئے سحر تو رات سے ہے

بےرخی میں ہے کیفِ سرشاری
تشنگی لطفِ التفات سے ہے

ذوقِ آرائشِ جمال سے دور
سادگی حسن کی صفات سے ہے

میں نہ ہوتا تو بات ہی کیا تھی
بات لیکن جو کائنات سے ہے

چھائی ہے گھٹا، اک جام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے
موسم ہے کھلا پیغام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

سب حسبِ کرم دلشاد رہے محفل میں مگر یہ یاد رہے
اِک ہم بھی ہیں تشنہ کام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

ہم حسنِ وفا کے دیوانے، نفرت کے نہیں ہیں پیمانے
ہے پیار ہمارا نام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

ہم چھپ کے چھپا کے محفل میں آنکھوں سے کسی کی پیتے ہیں
یہ بات نہیں ہے عام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

ہر دَور کے ہم ہیں بادہ کشاں ہے ظرف ہمارا بے پایاں
ہر جام ہو دُردِ آشام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

آنکھوں کے حسین پیغام بھی ہوں ہونٹوں کے کھنکتے جام بھی ہوں
چھٹ جائیں غم و آلام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

پی پی کے کلیم خستہ جگر صہبائے فریب حسن نظر
اب گرنے لگے ہے تھام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

دائم رہے یہ حال، یہ آلام بھی غلط
ماضی کو لوٹے گردشِ ایام بھی غلط

اس شہرِ بے چراغ میں کیا روشنی کا ذکر
کوئی جلے چراغِ سرِ شام بھی غلط

تیرا خلوص، تیرا کرم، ایک مصلحت
اپنی وفا ہے موردِ الزام بھی غلط

لطفِ حیات تو کہ ہے آغاز پُرکشش
ایسے میں فکرِ تلخیٔ انجام بھی غلط

اس عہدِ بے ضمیر کی لوحِ سیاہ پر
لکھے جو روشنی کا کوئی نام بھی غلط

ذکرِ خیالِ عشرتِ فردا بھی اک فریب
ہر لب کو زہرِ غم کا ملے جام بھی غلط

چمکے ہیں بامِ وقت پہ ہم چاند کی طرح
مشہور ہم نہیں ہیں تو گمنام بھی غلط

اِس بزمِ خود پرست و ریاکار میں کلیم
تحسینِ لطفِ خاص غلط عام بھی غلط



بے وطن مسافر ہیں، گھر جلا کے نکلے ہیں
ساتھ دل جلوں میں ہیں آپ ہم پرندوں کے

پر کتر کے شاہیں کے رکھ دیے ممولے نے
زاغ اور زغن حاکم ہیں ہم پرندوں کے

تذکروں سے نبیوں کے عشق کے فسانوں تک
کارنامے حیرت کے ہیں رقم پرندوں کے

خط رسانی کرنے کو یار تک کلیمؔ آخر
کون لیتا ہے جوکھم بیش و کم پرندوں کے

●

اِن آنسوؤں کی رُت بھی بھلا رُت کوئی ہوئی
ساون میں بھی زمین نہ دِل کی ہری ہوئی

اس عہدِ ارتقا میں ملی بھی تو یوں حیات
جیسے بھنور پہ ناؤ کوئی گھومتی ہوئی!

گزری جو ایک بار غموں کے الاؤ سے
دِل پر اُسی نظر کی ہے شبنم جمی ہوئی

کچھ سوچ کر سمجھ کے انہیں منہ لگائیے
کانٹوں سے ہے زبان گلوں کی بھری ہوئی

آئی ہجومِ یاس میں یوں بھی کسی کی یاد
مفلس کے جیسے خواب کی دولت بنی ہوئی

جب تک چھڑا نہ عارض و گیسو کا تذکرہ
شام و سحر کے روپ میں کب دلکشی ہوئی

تو میرے دل کے ٹوٹنے کو بے صدا نہ جان
اس کی صدا ہے تا بہ فلک گونجتی ہوئی

کچھ دن کٹے خزاں میں تو کچھ دن بہار میں
کچھ مل گئی حیات تو وہ بھی بٹی ہوئی

وہ نورِ صبحِ رُخ کہاں اب تو مگر کلیم
تصویرِ شامِ غم ہے نظر میں کھنچی ہوئی

●

فکرِ تلاشِ زیست میں جو گھومنے لگے
جھونکے ہوائے دشت کے ہم کو بھلے لگے

نظریں ملی تھیں دل بھی ملے اس کے باوجود
ذہنوں کی قربتوں میں مگر فاصلے لگے

چھوٹی تری گلی تو یہ احساس جاگ اٹھا
ہم سے زمانہ بھر کے حوادث گلے لگے

نیرنگیٔ مزاجِ زمانہ نہ پوچھیے
شعلے بھی ہاتھ آئے تو سب پھول سے لگے

پھر وعدۂ حسیں سے سنورنے لگا چمن
آنگن میں من کے مور کئی ناچنے لگے

اِس شہرِ تیرگی میں چلی جب ہوائے ظلم
روشن بہت چراغ سرِ دار کے لگے

موجوں سے کھیلتے پھرے ہم تو بھنور بھنور
طوفاں کو کیوں نہ جانے کنارے بھلے لگے

جیسے سمٹ گئی ہو کڑی دھوپ وقت کی
ہم کو جو تیری زلف کے سائے گھنے لگے

لے دے کے کچھ خیال تھے تنہائی کے رفیق
وہ بھی ہجومِ غم میں اب انجان سے لگے

کس کی عطا یہ طرزِ سخن ہے بتا کلیمؔ
اشعار زندگی کے ترے آئینے لگے

●

نگاہِ حسن جب تک بے حجابانہ نہیں اُٹھی
کسی ساغر سے دل میں موجِ مستانہ نہیں اُٹھی

غزالو! کچھ کہو رودادِ صحرا کس لیے پھر سے
صدائے قیس کوئی سوئے ویرانہ نہیں اُٹھی

گرے جاتے ہیں بام و در یہ کیسے اندرونِ دل
کبھی کچھ دھول تک بیرونِ کاشانہ نہیں اُٹھی

شریکِ زمرۂ اہلِ وفا ہم تیرے ہونے تک
کوئی تہمت بھلا کب بن کے افسانہ نہیں اُٹھی

عجب عرفانِ اہلِ عشق ہے یہ بعدِ مُردن بھی
نہ اُٹھی شمع جب تک لاشِ پروانہ نہیں اُٹھی

یہ ہے دربارِ جمہوری مگر اب تک یہاں یارو
بساطِ اقتدار و طرزِ شاہانہ نہیں اٹھی

نہ وہ قدریں پرانی ہیں نہ وہ جام و سبو لیکن
اجارہ داریٔ دستورِ مے خانہ نہیں اٹھی

کلیمؔ پارسا اور یہ سلیقہ جام اٹھانے کا
چھلکنا تو کجا اک موجِ پیمانہ نہیں اٹھی



زندگی بن کے شبِ غم نہ نظر میں رہنا
تو اُجالوں کی طرح خوابِ سحر میں رہنا

بے نیازانہ گزر جاؤں گا ہر منزل سے
تم مرے ساتھ ہر اک خوف و خطر میں رہنا

روشنی کھو دے نہ آنکھوں کی سوادِ شبِ غم
اشکِ خوں ناب مرے دیدۂ تر میں رہنا

کب کھلی آپ و ہوا راس انا کو آئی
اس کو بھاتا ہے سدا دل کے کھنڈر میں رہنا

یوں ہنسو ڈوبنے والوں پہ نہ اہلِ ساحل
ہم نے ساحل کا بھی دیکھا ہے بھنور میں رہنا

آندھیاں دیر و حرم کی نہ تھمیں یہ جب تک
شمع تم کر کے نہ روشن کبھی گھر میں رہنا

شامیانہ، نہ جنازے پہ غلافِ کمخواب
سادگی، تو ہی غریبوں کے سفر میں رہنا

رنگ آڑا دے نہ تغزل کا زمانے کی ہوا
تم حنا بن کے میرے دستِ ہنر میں رہنا

اے کلیمؔ آج کے اس دورِ فساد و شر میں
اپنی محدود سی دنیا کی گزر میں رہنا

●

ہے نظر میں کانٹوں کا گل کے ہو بہو ہونا
کون چاہے اب اُن کا زینتِ گلو ہونا

وقت کی ہواؤں میں آج کتنا مشکل ہے
شہرِ بے چراغاں میں شمعِ آبرو ہونا

اِس فضائے دہشت میں ساقیا کہاں ممکن
زندگی کے ہاتھوں میں جامِ آرزو ہونا

تشنگی کے عالم میں کیا سرور دیتا ہے
حسن کی نگاہوں کا بادہ و سبو ہونا

اِک عذابِ محفل ہے یا رب بے تکلّف بھی
ہم سے اُس کا تُو کہہ کر محوِ گفتگو ہونا

ہے امیدِ لاحاصل اِن انا پرستوں میں
فکر و فن کی کاوش میں اپنا سرخرو ہونا

ورثۂ تمدّن کا کر لو اب جتن یارو
ورنہ کس سے ممکن ہے حُسنِ آبرو ہونا

ہم گناہوں کے پیکر اور وہ داورِ محشر
کیا یہ حشر سے کم ہے اُن کے روبرو ہونا

جب ہوئی کلیمؔ اُس کی دید تو سمجھ پائے
کس نظر کو کہتے ہیں برقِ شعلہ رُو ہونا

●

میرا خونِ وفا شمع سرِ محفل میں رکھ دینا
تم اپنے دل کے سارے زخم میرے دل میں رکھ دینا

خدایا کیا غضب تھا مرتبہ دے کر خلافت کا
قیامت کا یہ فتنہ خاک دانِ دل میں رکھ دینا

میں لٹ کر وقت کے ہاتھوں تیری چوکھٹ پہ آیا ہوں
بھرم اپنے کرم کا کاسۂ سائل میں رکھ دینا

رہِ دیر و حرم پر اب نہ چل تو کام ہے اس کا
دلوں کی قربتوں کو دوریٔ منزل میں رکھ دینا

تڑپنا میرے قاتل کو اگر آتا نہ ہو یا رب
تو میرا یہ دلِ بسمل دلِ قاتل میں رکھ دینا

یہی ہے کارنامہ آج کے شاید مؤرخ کا
چھپا کر نورِ حق کو ظلمتِ باطل میں رکھ دینا

کلیمؔ اوراق میں یادِ دل کے ہے مہکا ہوا اب تک
کسی کا پھول چپکے سے کتابِ دل میں رکھ دینا



تہذیب و ارتقا کا جتن ہے ہمارے ساتھ
صدیوں کی زندگی کا چلن ہے ہمارے ساتھ

کیا جانے کب چھٹیں گی شبِ غم کی ظلمتیں
اک آرزوئے صبحِ وطن ہے ہمارے ساتھ

ہم کشتگانِ جرمِ محبت کو دیکھیے
مقتول حسرتوں کا کفن ہے ہمارے ساتھ

اپنا ہی شہر آج صلیبوں کا شہر ہے
دن رات فکرِ دار و رسن ہے ہمارے ساتھ

ہر سانس جب کہ مصلحت آمیز ہو گئی
خود زندگی ہماری گھٹن ہے ہمارے ساتھ

موسم بدل چکے ہیں بہت اقتدار کے
شاہین زیرِ زاغ و زغن ہے ہمارے ساتھ

صد اہتمامِ دعوتِ چشمِ ہوس لیے
حسنِ بتانِ توبہ شکن ہے ہمارے ساتھ

تنہائیوں کے دشت میں پھولوں کی رت لیے
ذکرِ سخن کی ساری پھبن ہے ہمارے ساتھ

گل پیرہن سبھی ہیں چمن میں مگر کلیم
حالات کی عجیب چبھن ہے ہمارے ساتھ

•

قطعہ

یہ سیاہ چاند، یہ جلتے ہوئے خوابوں کا دھواں
کب سے الجھی ہے نظر درد کے نظاروں میں
شبنمی سایۂ گیسو ہے تمہارا لیکن
ہم کو تپنا ہے ابھی وقت کے انگاروں میں

•

محبت کے بھرے ہیں قافلے ویرانہ ویرانہ
ہوا شہرِ نگاراں کا جو یہ دیوانہ دیوانہ

بڑی مشکل سے راس آئی ادائے ناز و خودداری
نہ لے جا دستِ محرومی مجھے کاشانہ کاشانہ

نہ پایا پھر وہ لطفِ صحبتِ بادہ کشی اپنا
بہت یارانِ میخانہ پھرے میخانہ میخانہ

وہی جلوے نئے اظہار کے ہیں ہر جگہ ورنہ
وہی ہے کعبہ کعبہ اور وہی بُت خانہ بُت خانہ

غمِ جاناں، غمِ ہستی بہت پُرکیف ہے لیکن
شرابِ تلخیٔ دوراں ہے اب پیمانہ پیمانہ

کلیمؔ اک باب ہوں تاریخ کا میں وقت شاہد ہے
میرا ہر دردِ عہدِ نو کا ہے افسانہ افسانہ

چہرے تو آج ہیں رُخِ مسرور کی طرح
لیکن دِلوں کے زخم ہیں ناسور کی طرح

شعلے میں ڈھل سکا نہ کبھی اشکِ غم میرا
جذبِ نگاہ ہو کے بھی ہے نور کی طرح

محتاط زندگی تو بہت آج خوب ہے
لیکن نہ ہو بسر کسی مغرور کی طرح

کیا اہلِ حق پہ چھائے گی باطل کی تیرگی
تنویر میں ہیں سورۂ النور کی طرح

صبحِ بہار لے کے اجالے کب آئے گی
کب سے حیات ہے شبِ دیجور کی طرح

جو بات حق کی ہے اُسے اب کہہ کے بے خطر
جائے گا کون دار پہ منصور کی طرح

کانٹوں کی دسترس میں ہے پھولوں کی آبرو
آئین گلستاں کا ہے جمہور کی طرح

دِل سے قریب ہیں وہ مگر منظروں میں ہیں
جیسے کوئی نگاہ میں ہو دور کی طرح

یوں ظلمتیں چھٹی ہیں محبت کی راہ میں
ہر موڑ پر حیات ملی نور کی طرح

گردِ غمِ حیات سے محفوظ ہے کلیم
ہر رُخ سے دل ہے آئینۂ طُور کی طرح

●

دُرِرِ اَربَع

قطعات

قطعات

کل وہ زیرِ گلِ چمن ہوگا
آج جو اِک گلِ شگفتہ ہے
حُسنِ مغرور کیا نہیں واقف
موت سے زندگی کا رشتہ ہے



جبر میں اختیار کا رجحان
ہوش میں ہے خمار کا رجحان
زندگی سے قریب کرتا ہے
زندگی سے فرار کا رجحان



ہو جو ذوقِ نگاہِ خود بینی
داغِ دل آفتاب ہو جائے
میکشی کا اگر سلیقہ ہو
غم، سُرورِ شراب ہو جائے

وہی دنیا وہی فسانہ ہے
فرق یہ ہے نیا زمانہ ہے
صرف اندازِ جَور بدلے ہیں
قصۂ غم وہی پرانا ہے

❀

ہائے جذبات کے نشیمن پر
یک بہ یک برق سی جو لہرائی
تیرے اور میرے درمیاں اے دوست
موج در موج تیرگی چھائی

❀

آندھیاں جو اُٹھیں زمانے کی
آشیاں لُٹ گئے بہاروں کے
ورنہ ہم بھی گُلِ شگفتہ تھے
اے وطن تیری شاخساروں کے

عہدِ پیری شباب کا سپنا
مہ جبیں، مہ لقا، مہِ تاباں
یوں اُبھرتا ہے ذہن میں جیسے
مفلسی میں تصورِ جاناں

چاند کا خواب نہ خوابوں کا حسیں شیش محل
اک دھواں سا ہے ابھی دِل کے نہاں خانے میں
جامِ شیریں ہے بہت پیارا تمہارا لیکن
بادۂ تلخ بھی ہے وقت کے میخانے میں

وقت ناساز گار ہے بڑھان
زندگی سوگوار ہے بڑھان
دُور ہیں سارے اقرباء ہم سے
مفلسی ہمکنار ہے بڑھان

جب مَیں خواب کے جھروکے میں
وہ مجھے دیکھ کر اُٹھے ہوں گے
سرِ مژگاں چراغ سُلگا کر
رات بھر میرے خط پڑھے ہوں گے

∴

کوئی حالات کے تقاضوں سے
آہ! مجبور جب ہوا ہوگا
اپنے اشکوں کی روشنائی سے
آخری خط مجھے لکھا ہوگا

∴

جب اُنہیں خواب گاہ میں اُن کی
یاد میری رُلا گئی ہوگی
دِل کی جلتی چِتا کے شعلوں میں
میری تصویرِ غم جلی ہوگی

دیکھا ہلالِ عید تو بزم چمن میں سب
خار و گلاب، شعلہ و شبنم گلے ملے
جب اختتامِ جشنِ بہاراں ہوا کلیمؔ
ہم سے تمام عمر کے پھر غم گلے ملے

گم ہو گیا ہے آج ہر اک صدمۂ شدید
پایا ہے زندگی نے کچھ ایسا سُرورِ دید
اک چاند ہے زمین پر، اک آسمان پر
یوں ہے جیسے آج عید کے اک روبرو ہے عید

اُس نے بھی چاندِ عید کا قاصد
دیکھا ہوگا تو اُس سے فرما دے
مجھکو حسرت ہے دیکھ لوں میں بھی
آ، مجھے آ کے چاند دِکھلا دے

اوراقِ زندگی پہ بڑی احتیاط سے
سمٹے ہوئے وجود میں اپنے بکھر گئے
ہم منتظر ہی رہ گئے فصلِ بہار کے
اکثر خزاں رسیدہ گلستاں سنور گئے



رنگینیٔ حیات کے گیسو سنوار کے
موسم بدل سکے نہ کبھی انتظار کے
آئی خزاں کے بعد ہی پھر تازہ اِک خزاں
لیکن نہ لوٹ کے پھر آئے دن بہار کے



رنگینیٔ شباب ہے تیری اُڑی ہوئی
تصویر سی خزاں کی ہے جیسے کھنچی ہوئی
کس تیرگیٔ یاس میں گم آج ہے حیات
پھیلے کی کیوں ہے چاندنی سنولائی سی ہوئی

وفا کی راہ میں ہر گام پروانے تو ملتے ہیں
چراغِ کشتۂ منزل کا پروانہ نہیں ملتا
شرابِ ارتقا کا جاگ اٹھا میکدہ پھر بھی
حیاتِ جاوداں کا کوئی پیمانہ نہیں ملتا

سازشیں، قتل، فسادات، جنوں، تلواریں
موسموں کے یہی اب نام ہوا کرتے ہیں
ذکر چھڑتا ہے جو اب پیار کا یکجہتی کا
فتنۂ دیر و حرم حشر بپا کرتے ہیں

پیار، ہمدردی، وفا، مہر، مروّت، اخلاق
یکجہت ہونے کے جذبات بہم بانٹ چلو
منصب چارہ گری دیر و حرم سے چھینو
ہم ہیں انسان تو انسان کے غم بانٹ چلو

قطعہ

●

تم نے افلاس و مصائب کے جگانے کے لیے
میری حساس محبت کا جھنجھوڑا ہے دماغ
اپنے تحفے میں مجھے دے کے حسیں تاج محل
طنز کا میرے خرابے میں جلایا ہے چراغ

●

عروسِ فکرِ غزل

(غزلیں)

کلیمؔ سج کے نئے رنگ میں تغزل کے
عروسِ فکرِ غزل پھر دکن سے نکلی ہے

کلیمؔ

دیکھا ہے جو حدیث میں اکثر الٰہی خیر
اِس دَور کا ہے ہو بہو منظر الٰہی خیر

اِک مشتِ خاک چاند کے رُخ پر الٰہی خیر
ہو آسماں زمیں سے سبک سر الٰہی خیر

پیتے ہیں روشنی کو اندھیروں کے اژدہے
چہرے بجھے بجھے سے ہیں اکثر الٰہی خیر

گھٹتے رہیں جو فاصلے ارض و سما کے بیچ
کوزوں میں بند ہوں گے سمندر الٰہی خیر

دیکھا ہے یہ بھی گنگ و جمن کے دیار میں
ڈوبے ہیں پھول تیرے ہیں پتھر الٰہی خیر

برکاتِ حُسنِ ذہنِ مساوات دیکھئے
جُگنو ہے آفتاب کا ہمسر الٰہی خیر

گلشن میں گُل ہیں خارِ مغیلاں بنے ہوئے
اور خار ہیں تمام گُلِ تر الٰہی خیر

شاہیں تو بال و پر سے بریدہ پڑے رہے
کرگس کرے ہے راج چمن پر الٰہی خیر

تسخیرِ عشق کے لیے نکلے بُتانِ شوق
لے کر جمالیات کا لشکر الٰہی خیر

بارش میں پتھروں کی ہیں مسمار شہر شہر
محفوظ کانچ کے ہیں مگر گھر الٰہی خیر

خود سر بھی، خود غرض بھی، وفا ناشناس بھی
یہ قوم کے ہیں خیر سے رہبر الٰہی خیر

شب میں رنگے رہے مئے سے عمامہ، عبا، قبا
دن میں ہو شیخ برسرِ منبر الٰہی خیر

کم فہم، کم سواد، کم آموز، کم سخن
اس پر بھی ہے کلیمؔ سخنور الٰہی خیر

کیا کہیے حالِ شہرِ نگاراں روش روش
ہر گل کدہ ہے خون میں غلطاں روش روش

فیضانِ حسنِ جلوۂ جمہور دیکھیے
مہکا ہوا ہے آج کا انساں روش روش

یہ نفرتوں کی دھوپ یہ جلتا ہوا سماں
سایہ بھی اب ہے اپنا گریزاں روش روش

ہر ظلمتِ حیات سے پھوٹی کرن کرن
ہر صبح رشک ہے شامِ غریباں روش روش

اہلِ جنوں ہیں مظہرِ ہوش و خرد تمام
اہلِ خرد ہیں دست و گریباں روش روش

٢٦٥

کچھ واقعے عجیب ہیں انصاف بھی عجیب
جرم و سزا کے ہیں نئے عنواں روش روش

یوں مسکرا رہی ہے ہر ایجادِ ارتقا
ملتے ہیں جیسے موت کے ساماں روش روش

فکر و خیال چارہ گری کیا ترے بغیر
ہر دل ہے آج کشتۂ دوراں روش روش

قرباں ہوائے وقت کے ہو جائیے کلیم
مہکا ہے فکر و فن کا گلستاں روش روش



لے کر شکستہ آئینۂ دل کوئی اداس
پتھراؤ سے ہوا کوئی گھائل کوئی اداس

در در پھرے ہے لے کے وہی آج خالی ہاتھ
ٹوٹانہ جس کے در سے تھا سائل کوئی اداس

طوفان تو سفینہ ڈبو کر گزر گیا
اب چپ کھڑا ہے کیوں لبِ ساحل کوئی اداس

لو آبروئے شمع تو کچھ اور بڑھ گئی
پروانہ جل گیا سرِ محفل کوئی اداس

کیا جانے قتل کر کے مجھے دیر تک بہت
کیا سوچتا کھڑا رہا قاتل کوئی اداس

خوش فہمیاں بنا گئیں پھر کانچ کے محل
کر دے نہ پھر نہیں حادثہ دِل کوئی اداس

کتنی رُتوں کے جانے اندھیرے سمیٹ کر
ڈوبا ہے پچھلی شب مہِ کامل کوئی اداس

اب غم کلیمؔ اس کے بچھڑنے کا کیا کریں
یادوں کی جو بنا گیا منزل کوئی اداس



رنگ و بُو کا لُٹتا ہے کب سے کارواں پھر بھی
مسکنِ بہاراں ہے شہرِ دلبراں پھر بھی

جانے کتنے موسم کے زخم دل سے رستے ہیں
خوگرِ نظارہ ہے چشمِ خونچکاں پھر بھی

تم ہزار مہکاؤ پھول عقل و دانش کے
ہے جنوں میں جو میرے بات وہ کہاں پھر بھی

لاکھ مختصر ہوں گے یہ وفا کے افسانے
تذکرہ میرا ہوگا زیبِ داستاں پھر بھی

ہے یقین مستقبل آج کس قدر روشن
لوگ اِس زمانے سے کیوں ہیں بدگماں پھر بھی

امن کے ہیں پیغمبر پیار کے ہیں ہم پیکر
جانے کیوں ہمارا ہے دشمن آسماں پھر بھی

قد بڑھا کر اڑ جائیں لاکھ آسمانوں تک
خاکداں میں گرتے ہیں اہلِ خاکداں پھر بھی

جب صدا بہ صحرا ہو ہر صدائے محرومی
بے دلی بڑھاتی ہے ذوقِ سرکشاں پھر بھی

دور دور رہ کر بھی شہرتوں کے فتنوں سے
ہے کلیم کم آمیز کتنا خوش بیاں پھر بھی

●

میں حق شناس ہوں یارو مجھے فریب نہ دو
فریبِ زیست کے مارو مجھے فریب نہ دو

چمن میں رہوں مجھے ہے موسموں کا اندازہ
خزاں بدوشِ بہارو مجھے فریب نہ دو

وہ خواہشات جہاں آ کے مجھ سے تم بچھڑے
وہاں سے پھر نہ پکارو مجھے فریب نہ دو

شعور مجھ کو میسّر ہے نور و ظلمت کا
حیاتِ نو کے نظارو مجھے فریب نہ دو

سجا سجا کے جنہیں وقت نے جلائے ہیں
وہ خواب پھر نہ سنوارو مجھے فریب نہ دو

میں ارتقائے جہانِ خرد سمجھتا ہوں
جنوں نواز سہارو مجھے فریب نہ دو

غموں کے بحر تلاطم میں عمر گزری ہے
اب اے بھنور کے کنارو مجھے فریب نہ دو

ہے تیرگی کے سوا کیا تمھارے پہلو میں
حسین چاند ستارو مجھے فریب نہ دو

یہ بے ضمیر زمانہ کلیمؔ ہے پھر بھی
ضمیر اپنا نکھارو مجھے فریب نہ دو

○

نگارِ رُوئے بتاں جو جدا جدا نہ لگے
ہجومِ حُسن میں پھر آپ کا پتہ نہ لگے

سنور کے موسمِ گُل اب کے آنے والا ہے
اِسے بھی دیر و حرم کی کہیں ہوا نہ لگے

دِکھائے لاکھ تماشائے رنگ و بو لیکن
وہ شہر شہر ہی کیا جس میں جی ذرا نہ لگے

جلا جلا کے کسی گھر کو خوش جو ہوتا ہے
خدا کرے وہ اُسے اپنا آشیانہ لگے

میں دن کو شب نہ کہوں گا نہ شب کو دن گر
یہ مرا عیب ہی آپ کو بھلا نہ لگے

سمجھ کے ننگِ چمن ہم کو دیکھنے والو
کہیں وہ خود تمہیں اپنا ہی آئینہ نہ لگے

سنا ہے آج سرِ بزم اُن کے دل پر بھی
کلیمؔ آپ کے اشعار تازیانہ لگے



کچھ غم ہیں فکرِ زلفِ رسا کے بغیر بھی
جھکے ہیں پھول بارِ صبا کے بغیر بھی

مرہونِ چشمِ نم نہیں اشکِ غمِ نہاں
برسات ہو گئی ہے گھٹا کے بغیر بھی

ہے تشنگی کا چشمِ تغافل سے واسطہ
پُر کیف ہم ہیں جامِ عطا کے بغیر بھی

رُخ پُر فریبِ حسنِ زمانہ کے ہیں نقاب
گرتے ہیں لوگ لغزشِ پا کے بغیر بھی

تصویرِ زندگی میں ہے شام و سحر کا رنگ
گزرا ہے کون مہر و جفا کے بغیر بھی

اِن پھانسیوں پہ نام ہے اپنا لکھا ہوا
ہم معتبر ہیں تیری وفا کے بغیر بھی

جذبِ وفا میں دل کی نیابت نظر کو ہے
اپنی دُعا ہے دستِ دُعا کے بغیر بھی

ہم بندگانِ حق پہ تشدد ہے اِس طرح
جیسے وہ مقتدر ہیں خدا کے بغیر بھی

گھونگھٹ عروسِ فکرِ غزل کا بھلا کلیمؔ
اٹھتا کہاں ہے حسن و ادا کے بغیر بھی

●

اک آرزو نظر سے جھلکتی ضرور ہے
دِل کے قریب برق چمکتی ضرور ہے

محتاط چشمِ شوق رہے لاکھ بزم میں !
موجِ شرابِ جام پہ چھلکتی ضرور ہے

ہنگامۂ سکوت میں ہے ربطِ سوزِ غم
راتوں میں دن کی آگ دہکتی ضرور ہے

زعمِ شعور، کیفِ انا، لطفِ آگہی
اس بے خودی میں فکر بہکتی ضرور ہے

چلتی ہے جب بھی دل میں ہوا تجربات کی
شاخِ گُلِ شعور مہکتی ضرور ہے

سپنوں کے اس کھنڈر میں شبِ غم کے ساز پر
پرچھائیں سی کسی کی تھرکتی ضرور ہے

سوزِ جفا تو مانگے ہے شبنم نگاہ کی
ورنہ یہ دھیمی آنچ بھڑکتی ضرور ہے

سنولا نہ جائے چاند تصوّر کی رات کا
پچھلے کی چاندنی بھی چٹکتی ضرور ہے

چھپتی ہے کب چھپانے سے کوئی کسک کلیمؔ
رنگِ غزل سے تیرے جھلکتی ضرور ہے



فضائے عالمِ کیف و سرور تک پہونچے
غموں کی دھوپ میں تپ کر شعور تک پہونچے

صبا کے دوش پہ خاکِ چراغِ دل اپنی
خدا کرے تری چشمِ غیور تک پہونچے

جنونِ شوق میں یہ ارتقا کے دیوانے
عجیب جادۂ ظلمات و نور تک پہونچے

ہم اہلِ درد کو بس اک نظر ہی کافی ہے
زہے نصیب! جو تیرے حضور تک پہونچے

کہاں کے عدل و عدالت کہاں کوئی دستور
عذابِ دار تو ہر بے قصور تک پہونچے

وفا کی راہ میں ہم وقت کی صلیبوں تک
ترے قریب سے گزرے تو دور تک پہونچے

بغیر اشک دعا کمیل تو نہیں پھر بھی
دعا وہی ہے جو باب غفور تک پہونچے

ہیں کتنے جلوہ گر و دیدہ ور یہاں لیکن
کوئی کلیم کہاں ہے جو طور تک پہونچے



آتا نہیں ہے کوئی درِ دل کے آس پاس
چھایا ہوا غبار ہے منزل کے آس پاس

ہر رہگزارِ حسن پہ میلہ ہوس کا ہے
اب کوئی قیس ہی نہیں محمل کے آس پاس

ٹکرا رہی ہے اب نہ کوئی موجِ آرزو
ہے برف سی جمی ہوئی ساحل کے آس پاس

دیتے رہے ہیں خود جسے خیرات اہلِ خیر
ہیں اہلِ خیر اب اسی سائل کے آس پاس

دیر و حرم میں بحث ہے الزامِ قتل پر
اک کشمکش سی ہے حق و باطل کے آس پاس

یوں لوگ ڈھونڈھتے ہیں یہ قتل کا سراغ
قاتل نظر میں رکھ کے بھی قاتل کے آس پاس

آسانیوں کی راہ جو پائی تو یوں لگا
ہر شے حسیں ہے منزل مشکل کے آس پاس

تھے روشنیٔ شمع کی جو آبرو کلیم
پروانے اب کہاں ہیں وہ محفل کے آس پاس



تلخ و شیریں ہم پیے جائیں گے پیمانے بہت
زندگی آباد ہوں گے تیرے میخانے بہت

اب جنوں باقی ہے صحرا ہے نہ زندان و صلیب
ذات کی تنہائیوں میں گم ہیں دیوانے بہت

شب کی سونی بزم میں ہے کم وفا کی روشنی
لو بڑھاؤ شمع کی آئیں گے پروانے بہت

جب کریں گے سرفروشوں کے زمانے تذکرے
منفرد سب میں رہیں گے اپنے افسانے بہت

تیرگی جن کا مقدر، تیرگی جن کا وجود
وہ چلے تھے روشنی دنیا میں پھیلانے بہت

تجربوں کی آندھیوں میں بجلیوں کی دوڑ میں
ہم نے مہکائے شعورِ دل کے گل خانے بہت

زندگی تو کٹ گئی کانٹوں پہ لیکن بعدِ مرگ
تربتِ فنکار پر ہیں گل کے نذرانے بہت

کچھ غرض مند اجنبی ایسے بھی اب ملنے لگے
جیسے برسوں سے ہیں ان کے اپنے یارانے بہت

مصلحت کے مقتلوں میں بہرِ قربانی کلیمؔ
ہم سے دیوانے کہاں پائیں گے فرزانے بہت

●

تجربوں کی لکھ رہے ہیں لوگ تحریریں تمام
زندگی تشنہ ہے پھر بھی تیری تفسیریں تمام

موجِ صبا، نکہتِ گل، مہر و مہ، صبحِ بہار
آپ کی تصویر سے ملتی ہیں تصویریں تمام

چاندنی کی نرم کرنیں یا شرارے برق کے
آپ کی تنویرِ رخ کی ہیں یہ تنویریں تمام

وقت سازی، حیلہ جوئی، چشم پوشی، بے حسی
مصلحت زادوں سے لپٹی ہیں یہ زنجیریں تمام

مشعلِ تدبیر لے کر ظلمتِ تقدیر میں
ڈھونڈیئے مل جائیں گی خوابوں کی تعبیریں تمام

ہوں غلط اعمال جب ناقص ہوں سب فکر و خیال
کیوں نہ کھو جائیں دعاؤں کی بھی تاثیریں تمام

ذکرِ اخلاص و صداقت حُسنِ نیت کے بغیر
کام دیں گی رہبروں کی کیا یہ تقریریں تمام

وقت ہے ٹوٹے دِلوں کو جوڑ کر پا لو نجات
ورنہ ہوں گی درگزر کب ایسی تقصیریں تمام

ارتقائے فطرتِ انساں ازل سے ہے کلیمؔ
برق و باراں سے کہاں رکتی ہیں تعمیریں تمام



تابانیِ رُخِ دُرِ شہوار چھن گئی
اِس دَور کی جو غیرتِ پندار چھن گئی

پہلی سی کاٹ ہے نہ ادا ہے نہ بانکپن
اب قتل کیا کریں کہ وہ تلوار چھن گئی

اب شہر شہر عام ہوا خنجروں کا رقص
پائل ہے بے صدا کہ وہ جھنکار چھن گئی

اٹھتی نہ تھی جو شرم و ندامت سے کل تلک
وہ بھی ادائے چشمِ گنہگار چھن گئی!

بکنے لگی ہے اپنے ہی زخموں کی آبرو
کیا کیجیے کہ ندرتِ فنکار چھن گئی

۲۸۷

رہزنِ حیات تو رہی رہزن کے روپ میں
ہم یوں لُٹے کہ دولت کردار چھن گئی

اب لذتِ بیاں ہے نہ تقریر میں اثر
وہ دلکشی وہ شوخیٔ گفتار چھن گئی

گزری تمام عمر کلیمؔ اپنی اِس طرح
سو بار زندگی ملی سو بار چھن گئی



کشتگانِ گردشِ ایّام ہوناتھا ہوئے
گم تھے ہم خوابوں میں جو انجام ہوناتھا ہوئے

ہر فسادِ نو پہ اِک قانونِ نو بنتا گیا!
پھر بھی صبح و شام قتلِ عام ہوناتھا ہوئے

اپنی لاش اپنے ہی کاندھوں پہ لیے ہم عمر بھر
ہمسفر حالات کے ہر گام ہوناتھا ہوئے

ظلمتوں نے رات کی مانگے لہو کے پھر چراغ
پھر اجالوں کو ہمارے نام ہوناتھا ہوئے

تھا بپا ہر شہر میں ہنگامۂ زاغ و زغن
اور ہم شاہین زیرِ دام ہوناتھا ہوئے

اُس ستم ایجاد کی ہر طرزِ نو پر جان دی
پھر بھی زیرِ خنجرِ دُشنام ہونا تھا ہوئے

آبروہم نے بڑھائی شمع کی، شہرت بھی دی
ہم سے پروانے مگر گمنام ہونا تھا ہوئے

اب تو مائل ہے نمائش پر مزاجِ حُسن بھی
اہلِ دِل کو عشق میں ناکام ہونا تھا ہوئے

ایک میٹھا زہر جیسے پیار تھا اُس کا **کلیم**
جاں بہ لب جامِ لبِ گلفام ہونا تھا ہوئے

●

لٹا ہوں ایسا کہ کوئی نشاں نہیں ملتا
میرے چمن میں میرا آشیاں نہیں ملتا

تراشا شہر کے شیشہ گروں نے کچھ ایسا
خود اپنا چہرہ بھی اب ہے کہاں نہیں ملتا

ڈھلے جو رات کے سائے تو غم کے سورج کی
وہ دھوپ ہے کہ کوئی سائباں نہیں ملتا

چمن چمن پہ ہیں بازوں کی دہشتیں طاری
کوئی پرند کہیں نغمہ خواں نہیں ملتا

نظر میں جب سے ہے منظر ترے بچھڑنے کا
وہ رت جگے ہیں کہ خوابِ گراں نہیں ملتا

اُداس اُداس ہوں ڈستی ہے گھر کی تنہائی
تمہارا قرب جو جانِ جہاں نہیں ملتا

نوازے لوگوں کو جس نے محل خود آج اُسے
وطن میں رہنے کو اپنے مکاں نہیں ملتا

وہی مقام ہے رستے بھی ہیں وہی لیکن
کوئی مسافرِ عزمِ جواں نہیں ملتا

یہ شہر تنگ دِلاں ہے کلیمؔ اب اِس میں
کھلی زمین کھلا آسماں نہیں ملتا



مصلحت ہو یا غرض پیار سب کا جھیلا ہے
عمر بھر یہ قسمت کا میں نے کھیل کھیلا ہے

رُت جگوں کی پروردہ، پیاسی آرزوں کا
صُبحدم اُمیدوں کی پنگھٹوں پہ میلہ ہے

پیار، دشمنی، شادی، رنج، خواب، بے خوابی
یہ ہجوم اور پھر بھی دل مرا اکیلا ہے

دِل ہے وہ نہ دِل والے اب تو دِل کے شہروں میں
پتھروں کی بارش ہے اور لہو کا ریلا ہے

تو نہ اے غمِ دوراں پاس آ کر اب دِل میں
پھول بَن ہے یادوں کا اور وطن کی بیلا ہے

رہبروں کے وعدوں کے خواب ہیں حسیں کتنے
زندگی کھلونوں کا جیسے کوئی ٹھیلا ہے

زیست کا، زمانے کا، آپ کی محبت کا
اور کیا سِوا اِس کے غم کسی نے جھیلا ہے

سوچ کر کلیمؔ اُن سے ربط تو بڑھا اپنا
زندگی میں ہر لمحہ اِک نیا جھمیلا ہے



میں نے لکھی لہو سے تو تحریر بول اٹھی
ہر قتلِ بے قصور کی تفسیر بول اٹھی

زنداں میں تو میں مُہر بہ لب ہی رہا مگر
جھنکار بن کے پاؤں کی زنجیر بول اٹھی

پوچھا کہ قتل و خون یہ ہے کس نظر کا شوق
تن کر نگاہِ وقت کی شمشیر بول اٹھی

بے کار ہے طلب جو خلوصِ طلب نہ ہو
اٹھے دعا کو ہاتھ تو تاثیر بول اٹھی

آئینہ دیکھتے ہوئے جب بھی خیال میں
میں چپ رہا تو آپ کی تصویر بول اٹھی

جب خزاں بہاروں سے زیر ہونے لگتی ہے
صُورتوں میں پت جھڑ کی ڈھیر ہونے لگتی ہے

رات چوس لیتی ہے خون اور تاروں کا
دِن کے جب نکلنے میں دیر ہونے لگتی ہے

شہر شہر چھایا ہے جنگلوں کا پھر قانون
پھر درندگی جیسے شیر ہونے لگتی ہے

جونک بن کے چمٹی ہے فکرِ زندگی جب سے
خونِ دِل کا پی پی کر سیر ہونے لگتی ہے

زخم مسکراتے ہیں دِل کے تو دریدہ دِل پر
جانے کِن اُجالوں کی پھیر ہونے لگتی ہے

دَیر اور حرم میں جب زلزلے سے آتے ہیں
جنّتِ وطن یارو ڈھیر ہونے لگتی ہے

کرتی ہے کلیمؔ اکثر جب ہوس جگہ دل میں
تب بھنور کی بانہوں کا گھیر ہونے لگتی ہے



قطعہ



ہائے جذبات کے نشیمن پر
یک بہ یک برق سی جو لہرائی
تیرے اور میرے درمیاں اے دوست
موج در موج تیرگی چھائی



اب ذکرِ گلِ رعنا اے دِل نہیں کرنا ہے
غزلوں میں آ سے اپنی شامل نہیں کرنا ہے

تو شوق سے کام اپنی شمشیرِ نظر سے لے
شرمندہ مگر تجھ کو قاتل نہیں کرنا ہے

مدّت ہوئی ہم اپنی کشتی کو جلا آئے
اب لوٹ کے رُخ سوئے ساحل نہیں کرنا ہے

ہر شاخ سے لپٹے ہوں جب سانپ تو پھولوں کو
تتلی کی طرح دِل کو مائل نہیں کرنا ہے

راتوں کو نشیمن بھی ہیں جلنے لگے اب تو
اے طائرِ جاں خود کو غافل نہیں کرنا ہے

گمراہی کا رستہ جو عالم ہمیں دکھلائے
اب علم اُس عالم سے حاصل نہیں کرنا ہے

ساقی تری آنکھوں کی مے ہم کو ملے ورنہ!
اِس زہر سے ہستی کو زائل نہیں کرنا ہے

ہاں! تم کو مبارک ہو یہ بزمِ فریب اپنی
ہم کو تو مگر حق کو باطل نہیں کرنا ہے

اب ہوش کلیم آیا سب نذرِ جنوں کر کے
اب دِل کی کبھی دل میں منزل نہیں کرنا ہے

●

اشک شعلے میں ڈھلے' یہ مجھے منظور نہیں
حسن پر داغ لگے' یہ مجھے منظور نہیں

زندگی تیرے حسیں باغ کے گلدانوں میں
پھول کاغذ کا سجے' یہ مجھے منظور نہیں

ساتھ رہتا وہ ہمیشہ تو کوئی بات بھی تھی
دو قدم ساتھ چلے' یہ مجھے منظور نہیں

میرے ہاتھوں کی لکیروں پہ بھی وقت کی گرد
تیرے چہرے پہ پڑے' یہ مجھے منظور نہیں

شمع و پروانہ جلیں جل کے سحر تک باہم
یہ جلے' وہ نہ جلے' یہ مجھے منظور نہیں

پیار کے باغ میں محبوب کا اپنے کوئی
پیڑ پر نام لکھے، یہ مجھے منظور نہیں

گلشنِ فکرِ کلیم اپنا سجاؤ لیکن
گل سے خوشبو نہ اٹھے، یہ مجھے منظور نہیں

رُت وہ گُل کی پھبن میں آ نہ سکی
جو گئی پھر چمن میں آ نہ سکی

اُن کے جانے کے بعد وہ خوشبو
پھر کبھی پھول بن میں آ نہ سکی

وہ جو شامِ اودھ کے تھی مانند
شام پھر وہ دکن میں آ نہ سکی

وہ جو آئے تو روشنی آئی
اُن سے پہلے نین میں آ نہ سکی

بات جو اپنے رُت جگوں میں تھی
بات ویسی ملن میں آ نہ سکی

تم شریکِ سفر رہے جب تک
کچھ تھکاوٹ بدن میں آ نہ سکی

ہے جو رنگینیٔ عروسِ غزل
کسی صنفِ سخن میں آ نہ سکی

گُل چراغِ کلیمؔ ہے جب سے
روشنی انجمن میں آ نہ سکی



نس نس میں ہر نگاہ کا ہے تیر ہو بہو
ہے کتنی دلنواز یہ تعزیر ہو بہو

ہر غم ہے میرے سلسلۂ غم کی اک کڑی
زنجیر میں ہوں حلقۂ زنجیر ہو بہو

خود آئینہ میں بن گیا آئینہ دیکھ کر
تصویر میری تھی تری تصویر ہو بہو

دیکھا ورق ورق جو گلوں کا تو یوں لگا
تیری کتاب رخ کی ہے تفسیر ہو بہو

کیا برق کی اداؤں میں یہ بھی ہے اک ادا
تخریب کی ہے شکل میں تعمیر ہو بہو

شاید وہ زُلفِ کھول کے مستِ خرام ہیں
موجِ صبا میں مے کی ہے تاثیر ہُو بہُو

وہ یوں ہنسے جھجک کے مِری عرضِ شوق پر
سب جیسے کہہ گئی اُنہیں تاخیر ہُو بہُو

تو ٹوں جو شام گھر کو تو اکثر وہ شاخِ گُل
لپٹی ہے مجھ سے ہو کے بغلگیر ہُو بہُو

یہ رنگ، یہ مزاج، یہ فکر و نظر کلیمؔ
تیری غزل میں ہے تیری تصویر ہُو بہُو



دشمنی کا ہو وہ یا دوستی کا دروازہ
آپ ہی کی دیواریں آپ ہی کا دروازہ

آندھیاں بگاڑیں گی اس کا کیا جو قائم ہے
آبرو کی چوکھٹ پر مفلسی کا دروازہ

لاکھ بے سر و ساماں زندگی رہے گھر کی
پردہ دار ہے پھر بھی بیکسی کا دروازہ

رام کی جنم بھومی ہو کہ مسجدِ بابر
ایک ہی ہے ہر گھر کی شانتی کا دروازہ

دل پہ ہو مسلط جب پُر فریب گمراہی
کب انا پہ کھُلتا ہے آگہی کا دروازہ

یوں نظر جھلکتی ہے اُس کی آبگینوں سے
جیسے گھر میں پانی کے روشنی کا دروازہ

نیند سے جگائے جب موجِ رنگ و بُو کوئی
زندگی پہ کھلتا ہے زندگی کا دروازہ

جانے کس کے درشن کا راستہ بھر رہا منظر
چاند کے نگاہوں کی چاندنی کا دروازہ

کن حسیں امیدوں کے نام پر سنوارا تھا
لُٹ گیا فسادوں میں پھر کسی کا دروازہ

ایک عمر جب اس کا کر چکیں طواف آنکھیں
تب کھلا کلیم آخر دلبری کا دروازہ

●

خواب تک خیالوں تک ڈھیر سی کتابوں تک
رفتہ رفتہ آ پہونچی زندگی سرابوں تک

انجمن میں، محلوں میں اور شاہراہوں میں
حُسن ہے تیرا محدود اب کہاں نقابوں تک

جانے کس دو راہے پر ذہن کی ہیں پروازیں
رُخ کبھی عذابوں تک اور کبھی ثوابوں تک

ہے کہیں مری پتوار اور ہے کہیں کشتی
بہہ چلا جزیروں پر خواب کے حبابوں تک

کرب دِل کی چوٹوں کا، زخم شب کی ضربوں کے
پہنچتے رہے مجھ میں روح کے عذابوں تک

آپ دے گئے اب تک گُل کے تو کئی تحفے
ٹھہریئے ذرا میرے زخم کے حسابوں تک

دیکھ کر کوئی صورت یاد آ گئے ورنہ!
آپ سے ملاقاتیں اب فقط ہیں خوابوں تک

مختلف ہے کیا اس سے یہ نظامِ جمہوری
تھا کبھی جو وابستہ شاہ تک نوابوں تک

دے کے خط تو ٹھہرے پر اُن کا پڑھ تا ثر بھی
ورنہ ٹھہرے اے قاصدِ دل کہاں جوابوں تک

گُم ہے یوں بہاروں میں زندگی کلیمؔ اپنی
خواب زخموں کی ہے مہک گلابوں تک



صبحِ نو ظلمتِ شب گیر لیے پھرتی ہے
اور شب صورتِ تنویر لیے پھرتی ہے

تیغ کی، لاشوں کی، مقتل کی، کمیں گاہوں کی
زندگی اب یہی تصویر لیے پھرتی ہے

فکرِ پرواز میری کرگس و شاہیں کی طرح
کبھی ذلّت کبھی توقیر لیے پھرتی ہے

سربلند آج ہو کس طرح سے کوئی آخر
ہر نظر وقت کی شمشیر لیے پھرتی ہے

اب تو ہر سوچ کی تتلی کے پروں پر جیسے
راکھ ہر خواب کی تعبیر لیے پھرتی ہے

زلزلے جاگتے ہیں، حشر بھی ہوتا ہے بپا
جب دُعا درد کی تاثیر لیے پھرتی ہے

برتری کا مجھے احساس ہوا ہے جب سے
مجھ کو جکڑے ہوئے زنجیر لیے پھرتی ہے

روئے روشن کا تیرے عکس اُڑا کر شاید
چاندنی چاند کی تصویر لیے پھرتی ہے

میں کلیمؔ اپنے تعارف سے گریزاں ہوں مگر
میری شہرت مری تحریر لیے پھرتی ہے

●

گھر کا ساز و ساماں کیا اور یہ نمائش کیا
زلزلوں کے شہروں میں مستقل رہائش کیا

بندۂ محبت ہیں، خوگرِ وفا ہیں ہم
ہم سے سرفروشوں کے سر کی آزمائش کیا

ہیں ثبوت تو لیکن جج ہیں ساتھ قاتل کے
اس پہ پھر عدالت میں ہم کریں گے نالش کیا

اک جھلک نہ ہو جس میں اعتبارِ موسم کی
اس نظر کی شبنم کیا اس نظر کی تابش کیا

حسن حسن میں کیا ہے کیا بتائیں ہم لیکن
حسن حسن ہے تیرا حسن کی ستائش کیا

مال و زر نہ گھر کوئی افسری نہ سرداری
پھر مری تباہی کی وہ کریں گے سازش کیا

کیوں نقاب اُلٹ کر تم آ گئے یہاں آخر
اِن ہوس پرستوں میں حُسن کی نمائش کیا

آپ سے ہوں وابستہ آپ لاج رکھ لیں گے
آپ پر ہے سب روشن میں کروں گزارش کیا

اُس کی سرفرازی کا اِک کلیمؔ حیلہ تھا
ورنہ کوئی سائل کیا اور مری نوازش کیا

شبنم کی نمی، دھوپ کی تابش بھی بہت تھی
باتوں میں گلے بھی تھے ستائش بھی بہت تھی

کچھ راس بھی آئے تھے بدلتے ہوئے موسم
کچھ پھول کی فطرت میں نمائش بھی بہت تھی

پھر بھی نہ بجھی شمع خیالوں کی تمہارے
آندھی بھی بہت تیز تھی بارش بھی بہت تھی

کچھ ساغر و مینا میں گھلا پیار کا امرت
نظروں کی کبھی اتنی نوازش بھی بہت تھی

کانٹوں میں بھی کیوں روپ نہ آجاتا گلوں کا
اک شاخ پہ دونوں کی رہائش بھی بہت تھی

ساحل سے نہ کرتے رہیں طوفاں کا نظارہ
ہم ڈوبنے والوں کی یہ خواہش بھی بہت تھی

اُس شوخ کی صورت میں کشش تو تھی بَلا کی
سیرت میں مگر فطرتِ سازش بھی بہت تھی

تحریر جو چہروں کی کتابوں میں تھی لکھی
تم غور سے پڑھتے تو نگارش بھی بہت تھی

نکھرا ہوا کیوں رنگ تغزّل کا نہ ہوتا
اِس میں جو کلیمؔ آپ کی کاوش بھی بہت تھی



پیڑ ہر اک بے ثمر ہمدم کبھی پہلے نہ تھا
موسم ایسا باغ کا بیہم کبھی پہلے نہ تھا

جانے کیسی ہے تراش اس دور کے آئینے کی
چہرہ چہرہ اس قدر مبہم کبھی پہلے نہ تھا

ہو گیا اشکوں کا جل تھل صحنِ دل تیرے لیے
کھل کے برسا اتنا ابرِ غم کبھی پہلے نہ تھا

موجِ سوز و درد زیرِ شب اور جھمگھٹ یاد کے
دل کے دو آبے پہ یہ سنگم کبھی پہلے نہ تھا

کون لے بھاگا لٹیرا دولتِ دل لوٹ کر
بے کسی کا تیری یہ عالم کبھی پہلے نہ تھا

ہو گیا اہلِ چمن میں کیا نہ جانے سازباز
ربط زاغ و باز ہیں باہم کبھی پہلے نہ تھا

روشنی کو پی گئے ظلمت کے شاید اژدھے
یوں چراغِ رُخ ہر اک مدھم کبھی پہلے نہ تھا

یہ لباسِ مختصر، یہ جسمِ نازک، یہ جھلک
آپ کے جلووں کا یہ عالم کبھی پہلے نہ تھا

جو بھی مانگی اشکِ لرزاں سے دعا اس نے دیا
ہے کلیمؔ اس کا کرم جو کم کبھی پہلے نہ تھا



دلِ شعلہ گرِ برقِ تپاں کس کے لیے تھا
اس گھر سے جو اُٹھا وہ دھواں کس کے لیے تھا

جب تجھ کو یقیں تھا کہ نہیں آئے گا کوئی
دروازے پہ دستک کا گماں کس کے لیے تھا

راس آئی نہ پردیس کی جب آب و ہوا بھی
تو بے وطن اے طائرِ جاں کس کے لیے تھا

اِس دیدۂ بے خواب کی برسات میں شب بھر
بہتا ہوا پانی پہ مکاں کس کے لیے تھا

آنکھیں جو تیری سوئے فلک دیکھ رہی تھیں
اُن آنکھوں میں وہ چاند نہاں کس کے لیے تھا

پڑھتا تھا کوئی سورۂ یٰسین سرہانے
مقصودِ شفا وہ میری جاں کس کے لیے تھا

اخلاص میں دھوکہ کوئی شامل بھی تھا ورنہ
جاتا تیرا ہر بار وہاں کس کے لیے تھا

یہ شہرِ غزل آج گروہوں میں بٹا ہے
تو صاحبِ دیوان میاں کس کے لیے تھا

اِک عمر کلیمؔ آپ نے کچھ پایا نہ کھو کر!
پھر اب یہ غمِ سود و زیاں کس کے لیے تھا



جب زندگی آئینۂ تفسیر میں آئی
اُلجھی ہوئی اِس دَور کی تصویر میں آئی

جکڑا گیا جب قیدِ مصیبت میں تو جانا
کیوں دوست کی بو سی میری زنجیر میں آئی

جب صبح کی اُمّید میں جاں اپنی گنوائی
وہ آئی بھی تو صورتِ شب گیر میں آئی

جب تک نہ میرا خونِ وفا بھی ہوا شامل
رعنائی تیری کب کسی تعمیر میں آئی

قاتل جو ادا کاٹ کی تھی تیری نظر میں
اب وہ نگہِ وقت کی شمشیر میں آئی

یادوں کے دریچے میں چمک چاندنی لے کر
تصویر تیری چاند کی تصویر میں آئی

پُر کیف ترا خواب تھا اے چشمِ فسوں ساز
تلخی سی مگر زہر کی تعبیر میں آئی

ٹوٹی جو دُعا بابِ اجابت سے ہماری
تو سورۂ رحمٰن کی تاثیر میں آئی

یہ زیست جو ہے دردِ مُسلسل سے عبارت
کیوں کر کلیمؔ آپ کی تقدیر میں آئی



میرے ماضی، حال، مستقبل تک آیا ہے کوئی
بن کے سایہ ساتھ ہر منزل تک آیا ہے کوئی

ٹوٹ کر تارے کی صورت بن کے نورِ تیرگی
آسماں سے خاکدانِ دل تک آیا ہے کوئی

جا چکا طوفاں سفینے کو ڈبو کر تو مگر
جانے اب کیا دیکھنے ساحل تک آیا ہے کوئی

جس سے بچ کر وہ نکل آیا تھا پھر کیا سوچ کر
قتل ہونے کیوں اسی قاتل تک آیا ہے کوئی

غم کی سونی شب میں جب ہونے لگی کم روشنی
شمعِ محفل بن کے پھر محفل تک آیا ہے کوئی

غش کہیں کھا کر نہ گر جائے الٰہی خیر ہو
رقصِ بسمل دیکھنے بسمل تک آیا ہے کوئی

اپنے در سے بھیک جس کو کل تلک دیتا رہا
بن کے سائل آج اُسی سائل تک آیا ہے کوئی

ہمسفر مخلص جو ہوں تو ہے سفر آساں مگر
ساتھ کب ہر منزلِ مشکل تک آیا ہے کوئی

ڈھل کے میرے زخمِ احساسات کے خوں میں کلیمؔ
فکر و فن کی کاوشِ حاصل تک آیا ہے کوئی

●

شبنمی زلف کی ساون کی گھٹا مانگی ہے
تیری مست آنکھوں سے پینے کی رضا مانگی ہے

عشق میں تیرے فنا ہو کے بقا مانگی ہے
سرفروشوں نے شہیدوں کی قضا مانگی ہے

لاکھ تڑپایا ہے زخموں کی خلش نے پھر بھی
تیری رسوائی کی کب دِل نے دعا مانگی ہے

دِل کے شعلوں سے لگی دِل کی بجھانے تب کی
صبحدم شمع نے شبنم کی ہوا مانگی ہے

عشقِ صادق تو رہا مہر بہ بلب ہی اپنا
دِل کی چوٹوں نے مگر آہِ رسا مانگی ہے

شاخِ گُل پھینک کے تلوار اُٹھا لایا ہوں
وقت و حالات سے جینے کی ادا مانگی ہے

اب کے بہت رنگ نیا اُس کی بہارِ نو کا
یہ دستیں نے تیری چمن بوئے وفا مانگی ہے

مجھ گنہگار سے سائل کو نوازا اُس نے
دِل کی گہرائی سے جب میں نے دعا مانگی ہے

دیکھ کر جوشِ جنوں میرا زمانے نے کلیمؔ
مجھ دِوانے سے محبت کی ادا مانگی ہے

یوں تیرا رُوئے حسیں اشکِ نظر میں دیکھوں
جل پری جیسے سمندر کے سفر میں دیکھوں

کچھ عجب لطف وکرم اُس کا سحر میں دیکھوں
جب اُٹھیں ہاتھ دُعا کو تو اثر میں دیکھوں

شانِ مطلق میں تجھے، درد کی صورت خود میں
کبھی دل میں، کبھی پہلو میں، جگر میں دیکھوں

کب میں کلیوں میں تبسّم کی ترے دیکھوں ادا
رنگِ رُخسار ترا کب گُلِ تر میں دیکھوں

کاش! تو بھی کبھی منظر وہ سہانا دیکھے
ساتھ میں بھی تجھے سپنوں کے نگر میں دیکھوں

بیکسی! چل کہیں ہم اور بسیں گے جا کر
اب کیا اُجڑا سماں شہر میں، گھر میں دیکھوں

کون رہزن ہے کِسے آج میں سمجھوں رہبر
اک نیا خِضر ہر اک راہ گزر میں دیکھوں

آشیانے کی بِنا شاخِ چمن پر رکھ کر
عکسِ رُخِ آئینۂ برق و شرر میں دیکھوں

ہائے اوجھل ہوئیں نظروں سے اچانک جو کلیم
صورتیں اب وہ کہاں شام و سحر میں دیکھوں

یوں تیرا رُوئے حسیں اشکِ نظر میں دیکھوں
جل پری جیسے سمندر کے سفر میں دیکھوں

کچھ عجب لطف وکرم اُس کا سحر میں دیکھوں
جب اُٹھیں ہاتھ دُعا کو تو اثر میں دیکھوں

شانِ مطلق میں تجھے، درد کی صورت خود میں
کبھی دل میں، کبھی پہلو میں، جگر میں دیکھوں

کب میں کلیوں میں تبسّم کی ترے دیکھوں ادا
رنگِ رُخسار ترا کب گُلِ تر میں دیکھوں

کاش! تُو بھی کبھی منظر وہ سُہانا دیکھے
ساتھ میں بھی تجھے سپنوں کے نگر میں دیکھوں

بیکسی! چل کہیں ہم اور بسیں گے جا کر
اب کیا اُجڑا سماں شہر میں، گھر میں دیکھوں

کون رہزن ہے کِسے آج میں سمجھوں رہبر
اک نیا خضر ہر اک راہ گزر میں دیکھوں

آشیانے کی بِنا شاخِ چمن پر رکھ کر
عکسِ رُخِ آئینۂ برق و شرر میں دیکھوں

ہائے اوجھل ہوئیں نظروں سے اچانک جو کلیم
صورتیں اب وہ کہاں شام و سحر میں دیکھوں

شمیمِ شب نہ نسیمِ سحر سے آتی ہے
وہ بے خودی جو تیری اِک نظر سے آتی ہے

زمیں پہ بن کے قیامت اُدھر سے آتی ہے
دُعا جو لوٹ کے بابِ اثر سے آتی ہے

جو پھیل جاتی ہے آکر ہمارے آنگن میں
وہ بوئے خوں کہ نہ جانے کدھر سے آتی ہے

تمام گریۂ شب کا نچوڑ کر دامن !
نسیمِ صبح تیری چشمِ تر سے آتی ہے

تھا موج موج ہر اِک نقشِ پا تیرا رہبر
کنارے ناؤ جو بچ کر بھنور سے آتی ہے

نہ جانے کونسی وادی میں لے کے دِل اُترا
کہ بوئے دوست یہاں ہر شجر سے آتی ہے

جو بُوند بُوند کہ دھوتی ہے داغِ پیرہن
ضرور ہو کے وہ زخمِ جگر سے آتی ہے

ہزار راہِ مسافت طویل ہو لیکن
تھکن سفر میں کہاں ہمسفر سے آتی ہے

غزل کلیمؔ پہن کر قبا تغزّل کی
شعور و فکر کے دستِ ہنر سے آتی ہے

سنہرے خواب تمہارے جگا کے رکھے تھے
چراغ کتنے نظر میں جلا کے رکھے تھے

تنک مزاج وہ شبنم مزاج ہم پھر بھی
گلاب آگ میں جیسے کھلا کے رکھے تھے

بچانے وقت کے آسیب سے ترے ارماں
حصار میں سدا اپنی دعا کے رکھے تھے

تری نظر سے گرے ہم تو یوں لگا جیسے
خزاں کے برگ تھے رخِ پر ہوا کے رکھے تھے

لہو سے سینچ کے ہم عمر بھر گلستاں کو
بہار تیرے فسانے بچا کے رکھے تھے

نقاب اُٹھا کے حسینوں نے عشق والوں کے
ہر اک نظر کو تماشے بنا کے رکھے تھے

بپا عجب مرے اندر تھی خانہ جنگی سی
غموں نے پہرے جو باہر لگا کے رکھے تھے

بچھڑنے والوں نے اشکوں میں جلتی آنکھوں کے
چراغ پانی پہ جیسے جلا کے رکھے تھے

کتابِ دل میں چھپا کر کلیمؔ یادوں کے
یہ پھول آپ نے کس کی عطا کے رکھے تھے



ہوا کہاں کی یہ ہو کر چمن سے نکلی ہے
کہ بوئے خون ہر اک پیرہن سے نکلی ہے

ضیائے شمعِ وفا جس سے دل منوّر تھے
وہ بجھ کے کیوں دلِ اہلِ وطن سے نکلی ہے

مہک رہا ہے ہر اک زخمِ دل گلوں کی طرح
صبا جو ہو کے تمہارے بدن سے نکلی ہے

گلِ دمن کا لیے داغ اپنے دامن پر!
نسیمِ اشک فشاں پھر چمن سے نکلی ہے

سجا کے راکھ کو پلکوں پہ خواب کی جیسے
حیات آج کسی انجمن سے نکلی ہے

ہوائے شہر بتا خونِ بے گنہ لے کر
تو کس کی لذتِ کام و دہن سے نکلی ہے

بہار لاکھ پہن لے لباسِ گُل لیکن
وہ رُت کہاں جو ترے بانکپن سے نکلی ہے

نکھار چاند سے چہرے کو دے دیا اُس نے
وہ اِک کرن جو ترے سیم تن سے نکلی ہے

کلیمؔ سج کے نئے رنگ میں تغزل کے
عروسِ فکرِ غزل پھر دکن سے نکلی ہے

●

کوئی آئے کوئی خوشبوئے گُل تر سے اٹھے
مدّتیں ہوگئیں یادل کوئی بر سے اٹھے

وہ کڑی دھوپ کے ساتھی جو شجر بن کے رہے
ہائے اب اُن کے گھنے سائے بھی سر سے اٹھے

قابلِ دید ہر اک عضوِ بدن ہے اُن کا
آنکھ حیراں ہے کدھر دیکھے کدھر سے اٹھے

صحنِ دل میں جو ترے پیار کا سورج اترا
مسکراتے ہوئے ہم خوابِ سحر سے اٹھے

گردشِ موجِ بلا نے جو ڈبونا چاہا
تھام کر وہ مری کشتی کو بھنور سے اٹھے

چپ تھے سب رائے میرے قتل کی دینے میں مگر
دوست میرے تھے جدھر ہاتھ اُدھر سے اُٹھے

رنگِ نو بھر کے نئے خاکے غزل کی صورت
تا کلیمؔ احساسِ جواں دستِ ہنر سے اُٹھے



رقصِ ناتمام

منتخب اشعار

رقصِ ناتمام

(چند منتخب اشعار ناتمام غزلوں کے)

اندھیری رات کے شہروں کی قتل گاہوں میں
لہو میں تیرتی لاشیں دکھا رہا ہے قمر
زمیں سے آگ کے اُٹھتے ہوئے بگولوں میں
تمام جلتے ہوئے گھر دکھا رہا ہے قمر

ہیں مصلحت کے زیست پہ پہرے لگے ہوئے
اس تیرگی میں کس کو بھلا روشنی ملے
خودداریاں مزاج میں یوں تو رہیں بہت
لیکن ملے خلوص سے ہم جس سے بھی ملے

ہجوم غم میں بھلا کوئی آرزو کیا ہے
نمی گلاب کی شعلوں کے روبرو کیا ہے
کبھی تمہیں نہیں ہو سکتا اس کا اندازہ
ٹپک رہا ہے جو آنکھوں سے وہ لہو کیا ہے
یقیں ہے جبکہ جو قسمت میں ہے ملے گا ضرور
تو پھر یہ جہد مسلسل، یہ جستجو کیا ہے
نہ پوچھ ترکِ تعلق کی لذتیں ہم سے
نظر نظر میں ہوئی وہ جو گفتگو کیا ہے

اُٹھ کے نگاہ جو جھکی، برق سی اک چمک اٹھی
تم نہ کر ، ، ے

ہیں جلوے سب جُدا شام و سحر کے ورنہ پھر وہ بھی
بدلتے وقت کے چہروں میں پہچانے تو کہاں جاتے
اگر راس آگئی ہوتی تیرے در کی جبیں سائی
زمانے بھر کی پھر ہم ٹھوکریں کھاتے کہاں جاتے

حالات و وقت نے رُخِ احوال دیکھ کر
غم دیدیئے کئی مجھے خوشحال دیکھ کر
کس مُنہ سے اُن کے سامنے جاؤنگا حشر میں
شرما رہا ہوں نامۂ اعمال دیکھ کر
شادابیوں نے دشتِ عرب کی پناہ دی
ہم سے خزاں کے ماروں کے احوال دیکھ کر
اب لے چلا ہے آئینہ دل کہاں کلیمؔ
اس دورِ خود نمائی کے اشکال دیکھ کر

تھیں اتنی تُند و تیز ہواؤں کی یورشیں
برسے بغیر آج بھی بادل گزر گئے
دل کے چراغ آخر شب گھر میں دیکھ کر
جانے اُجالے صبح کے کیوں لوٹ کر گئے

پھر نہ ہو کوئی شب خوں رزم گاہ ہستی میں
مشعلِ صفِ مژگاں صف بہ صف ہی جلنے دو
پھر جنوں نہ بڑھ جائے ظلمتوں کی منزل تک
چاند کے دِوانے کو چاند سے بہلنے دو

چھوٹی تیری گلی بھی تو کب کھل کے جی سکے
زنداں ہے ایک جیسے ثواب و عذاب کا
ویرانیاں جو ہیں مرے چہرے کی دیکھئے
میں آئینہ ہوں ہر دلِ خانہ خراب کا

—

جو حرام تھا وہ حلال ہے، جو حلال تھا وہ حرام ہے
یہ عجیب دورِ حیات ہے یہاں درسِ دیر و حرم نہ دے
یہی فقر و فاقہ و نکبتیں، یہی زندگی کی مصیبتیں
یہ صلہ ہے فن کا تو اے خدا تو شعورِ لوح و قلم نہ دے

—

لوگ اُٹھا لیتے ہیں لاشوں پہ بھی دیوار مگر
کون گرتی ہوئی دیوار بچا سکتا ہے
ہم ہر اک دور میں ہیں نور کے مینار کلیم
ہم کو کب کوئی اندھیروں میں چھپا سکتا ہے

—

ملی ہے جو بھی قیادت تو صورتِ رہزن
کہاں سے خضر سا اب کوئی ہمسفر لاؤ
ٹلی ہیں یوں تو دُعا سے بھی آفتیں لیکن
کوئی سفارشِ اعمالِ معتبر لاؤ

—

احساس کے وجود میں جو زخم ہیں کلیم
منسوب کر رہا ہوں وہ غزلوں کے نام سے

صدیوں کی خزاؤں سے جو وابستہ رہا ہے
گلشن میں وہ کام آج بہاروں کو ملا ہے
خوابوں کے جزیروں کے بہت تیز تھے شعلے
اب خاک کے ملبے میں وہ کیا ڈھونڈ رہا ہے
مانا تم اُجالوں کے حصاروں میں ہو لیکن
ڈھلتا ہوا سورج تو رکے گا نہ رکا ہے

پل بھر میں ڈوب جانا تھا لیکن تمام عمر
اک اک بھنور کے گرد مجھے گھومنا پڑا
حالات کی اس چڑھتی ہوئی دھوپ میں کلیم
سائے کو بھی تو ساتھ میرا چھوڑنا پڑا

اپنی بلندیوں کا جائزہ لوگے نہ جب تلک
دنیا تمہاری راہ گزر تک نہ آئے گی
برگِ خزاں سمجھ کے جھڑاؤ نہ یوں ہمیں
پھر ورنہ کوئی چھاؤں شجر تک نہ آئیگی
